سلسلہِ
جانگداز
کرب وبلا کا تسلسل اوراولادِ رسولؐ
سیّد آفتاب حُسین کاظمی

سلسلہِ

جاں گداز

کرب وبلا کا تسلسل اوراولادِ رسولؐ

سیّد آفتاب حُسین کاظمی

نام کتاب: سلسلۂ جاں گداز۔ کرب وبلا کا تسلسل اور اولادِ رسول
مصنف: سیّد آفتاب حسین کاظمی
طبع: اوّل
تعداد: ایک ہزار

مکتبہ آلِ موسیٰ کاظمؑ
راولپنڈی کینٹ

کُجھ اُنج وی راہواں اوکھیاں سن

کُجھ گل وچ غم دا طوق وی سی

کُجھ شہر دے لوگ وی ظالم سن

کُجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

(منیر نیازی)

خراجِ عقیدت

دل کھینچتی ہے منزلِ آبائے رفتنی
جو اس پہ مر مٹے وہ ہی قسمت کے تھے دھنی

وہ شیر سو رہے ہیں وہاں کاظمین کے
ہیبت سے جن کی گرد ہوئے کوہ آہنی

شاہانِ فقر وہ مرے اجدادِ باکمال
کرتی ہے جن کی خاک بھی محتاج کو غنی

سرخم کیا نہ افسر و لشکر کے سامنے
کس مرتبہ بلند تھی اُن کی فروتنی

کرتی تھی اُن کے سایہ محمود میں قیام
قسمت مآبی، خوش نسبی، پاک دامنی

شب بھر مراقبے میں نہ لگتی تھی اُن کی آنکھ
دن کو تلاشِ رزق میں کرتے تھے جاں کنی

تھی گفتگو میں نرم خرامی نسیم کی
ہر چند وہ دلیر تھے تلوار کے دھنی

جاتے ہیں اب بھی اُن کی زیارت کو قافلے
اُس در کے زائروں کو نہیں خوفِ رہزنی

اُس آستاں کی خاک اگر ضوفشاں نہ ہو
بُرجوں سے آسمان کے اُڑ جائے روشنی

(ناصر کاظمی)

انتساب...

والد گرامی غفران مآب **سیّد شاہ رحمٰن کاظمی**ؒ مرحوم کے نام
جن کی تربیت نے میرے اندر یہ
احساس جگائے رکھا کہ میں
اولادِ امامِ کاظمؑ ہوں اور اجدادِ با
صفاء کی تبلیغی جدوجہد کا
امین بھی

پیاری والدہ جنت مکانی **حمیدہ بی بی**ؒ کے نام جن کی زبانی
کہانیاں سن کر بچپن سے ہی
میرے اندر حصولِ علم کی شمع
روشن ہوئی

تشکر (Aknowledgment)

اس کتاب کی تکمیل میں بہت سے رفقاء، دوستوں، اورعزیزوں کی معاونت رہی میں اُن کے جزبہ اور تعاون پر تہہ دل سے مشکور وممنون ہوں خصوصاً اپنی اہلیہ، برادرِخوردسیّدسرشار حسین کاظمی، جناب عابدحسین (منتظم مجالسِ عزاء مسجد امام علیؑ، العین)،مولانا سیّدشبرحسین رضوی (لکھنو، بھارت)،مولانا سیّدابنِ حسن نقوی (حوزہ علمیہ دمشق)، مولانا سیّدشمشاد احمد رضوی (الہ آباد بھارت) اور مولانا گلزارجعفری (دمشق) نے ہرممکن تعاون کیا۔ میں برادرم سید حضور امام کاظمی ایڈوکیٹ (مظفرآباد) سید شاہ حسین کاظمی، سید شاہ حسن کاظمی (راولپنڈی)، سیّد امتیازحسین کاظمی (راولپنڈی)، اورسیّد ابصارعباس (العین) اور اُن کی اہلیہ کی اس موضوع میں خصوصی دلچسپی اورتجاویز پر انتہائی ممنون ہوں، اُن مصنفین وعلماء کا ممنونِ احسان بھی ہوں جن کی زبان وقلم سے میں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیا اور قادرِمطلق سے دست بدعا ہوں کہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے درجات عالیہ میں اضافہ فرمائے۔

میں اللہ تبارک وتعالیٰ کاشکرگزار ہوں کہ اُس نے میری جستجو کو برقراررکھا اورمیری اس کوشش کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، میں نے اس کتاب کی شکل میں جو کچھ لکھا اپنے مالکِ حقیقی اوراُس کے دین کے حقیقی مبلغین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ حقہ علیہم السلام کی خوشنودی کے لئے لکھا ہے، اپنی اس کوشش کے صلہ میں رب العزّت سے جزائے خیر فی الدّارین کی عطا کا طالب وراجی اوراپنے مرحوم والدین کے لئے فضل ورحمت اورمغفرت کا طالب ہوں، اللہ تعالیٰ اُنہیں جوارِ آئمہ علیہم السلام میں جگہ عطا فرمائے۔الٰہی امین

فہرس

تمہید

حصہ اوّل

۱۔انسان اور فطری ہدایت

۲۔آغازِ کرب و بلا

۳۔آلِ رسول کی غربت

(ا) پہلا دور

(ب) دوسرا دور

(ج) تیسرا دور

حصّہ دوئم

۱۔ حقیقتِ تصوف

۲۔ حاصلِ کلام

۳۔ تتمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

الحمد للّٰه رب العالمين

و الصلوة و السلام علیٰ اشرف المرسلين و خاتم النبيين

احمد المجتبیٰ ابی القاسم محمد المصطفیٰ

و آله الطيبين الطاهرين

تمہید

علم کے میدان میں ہر نئی تحقیق نشانِ راہ ہوا کرتی ہے نشانِ منزل ہرگز نہیں ۔ لہٰذا تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی ، اہل علم کو اس دیوسائی میدان کو پاٹنے کے جتن ہمیشہ کرتے رہنا چاہئے ، صحیح یا غلط ، سچ یا جھوٹ کا فیصلہ ہر شخص کا انفرادی ہوا کرتا ہے جس کی بنیاد علم ، عقل ، اور فکر پر استوار ہوتی ہے ، کسی نتیجے یا فیصلے تک رسائی بعض اوقات دشتِ صحارہ سے زیادہ کھٹن اور کوہ ہمالیہ سے زیادہ دشوار گزار ثابت ہوتی ہے ، عزمِ تحقیق کبھی کوہ کن بن کر سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیرتا ہے تو کبھی گمشدہ تہذیب کی باقیات کو کھنگال کر گوہر مقصد تلاش کرتا ہے ، یہ جد و جہد انسان کو بعض اوقات وہ نتائج دکھاتی ہے جو خوشگور نہیں ہوا کرتے ، یہ افراد کے ذاتی عقیدوں میں بھی دراڑیں ڈال دیتے ہیں ، دراصل یہ ہی وہ منزل ہے جو ایک تحقیق دان کا اصل امتحان ہوا کرتی ہے ، باضمیر محقق سچ کہیں تو زمانہ خنجر بکف سر کاٹنے کو تیار کھڑا ہوتا ہے ، نہ کہیں تو ضمیر دل و دماغ پر تازیانے برساتا ہے ، لاکھوں اہل علم و تحقیق کو اس منزل پر سقراط بن کر زہر کا گھونٹ بھرنا پڑا اور لاکھوں نے

اپنے دین وایمان کو دُنیا کی لالچ میں بیچ ڈالا، یہ کوئی حیران کن بات نہیں بلکہ اس امر کی تصدیق ہے کہ یہ دُنیا خیر وشر کا مقام ہے اگر نیکی کو زندہ رہنا ہے تو بدی اُس کے تعاقب میں تا قیامت رہے گی، خیر وشر کی اس آماجگاہ میں مختلف معاشرتی نظام ہیں جن کی اپنی جداگانہ تہذیبی، تمدنی، فکری، اوراخلاقی اقدار ہیں، ان نظاموں میں مختلف رنگوں، مذہبوں، زبانوں، اورنسلوں کے انسان زندگی بسر کررہے ہیں، ہر تہذیب کے پیچھے انسانی جدوجہداورفکری کاوشوں کا ایک پیچیدہ سلسلہ ہے جسے اِن معاشروں میں رہنے والے افراد دوسری قوموں یا معاشروں سے بہتراوراعلیٰ قرار دیتے ہیں، یہ انسان کی فطری اورنفسی مجبوری ہے کہ وہ اپنی سوچ وفکراورتمام اشیا کو دوسروں سے افضل و برتر سمجھتا ہے، لیکن جب اس فطری تقاضہ پرعقل وحکمت غلبہ حاصل کرتی ہے تو انسان دوسروں کی نظیر سے اپنے نظریات اور مادی اشیا میں نہ صرف نقائص تلاش کرتا ہے بلکہ اُن کی اصلاح پر بھی غور وفکر کرتا ہے، جب اصلاح نہ کی جائے تو غلطیاں اور نقائص زندگی کا حصّہ بن جاتے ہیں اور پورا معاشرہ اُن کی لپیٹ میں آجاتا ہے چنانچہ اصلاح کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور یومِ آخرت تک رہے گی۔

اکیسوئیں صدی میں دُنیا مادی اورعلمی ترقی کے حیرت انگیز مراحل میں داخل ہوچکی ہے اورتقریباً دوسو سے زیادہ مما لک میں منقسم بھی، ان تمام مما لک میں اقوام کی اپنی ترجیحات ،نظریات، اورثقافتیں ہیں جو اگرایک طرف دوسروں سے کسی قدر میل کھاتی ہیں تو بعض معاشروں سے متصادم بھی ہیں، ہمارے معاشرے میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جوعلم وفکر سے عملاً کوئی رغبت نہیں رکھتے، اندھی تقلید اُن کی گھٹی میں پڑی ہے اورشاید مسلمانوں کے گھر جنم لینے کی وجہ سے ہی مسلمان ہیں، یہ لوگ تعلیم سے اگر بالکل ہی بیزارنہیں تو پھراسے نوکری کے حصول کا فقط ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، اس روش نے افراد میں علمی اورعقلی پسماندگی پیدا کردی ہے جس نے ذہنوں کومفلوج کرکے اس قابل نہیں

چھوڑا کہ وہ دینی اور دُنیاوی امور کو سمجھ کر ازخود اپنی کوئی رائے قائم کرسکیں، جس طرح ان کا مذہب موروثی ہے اسی طرح عقائد بھی۔ جہالت اور تنگ نظری نے اِن موروثی مسلمانوں کو ہٹ دھرمی کی اُس نہج پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہر بات کو اندھے عقائد کی سُولی پر چڑھایا جاتا ہے، اُردو زبان کے نامور دانشور اور شاعر جوش ملیح آبادی اپنی خودنوشت آپ بیتی میں ان عقائد کو باعثِ تکلیف قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں،

''درحقیقت لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ بُرے، ان کا اچھا یا بُرا لگنا مبنی ہوتا ہے کانوں کی موروثی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ بچپن سے جس طور سنتے آتے ہیں جب وہی لفظ بدلے ہوئے لہجے میں سنتے ہیں تو ہم کو تکلیف ہوتی ہے... یہ بات فقط لہجوں تک محدود نہیں، عقائد کے میدان میں بھی ہمارا یہی عالم ہے کہ جب ہم اپنے موروثی عقائد کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں حالانکہ عقائد ذہن انسانی کی موروثی عادات کے سوا اور کچھ ہوتے ہی نہیں۔'' (۱)

موروثی عقائد اور اندھا دھند تقلید کی وجہ سے تاریخ کا ایک بڑا حصہّ موجودہ دور کے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہے، اور یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ مختلف سلسہ ہائے تصوف وطریقت اور حضور ختمی مرتب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے صدیوں بعد جنم لینے والے بعض فرقے ہی اسلام کا اصل دھارا ہیں جن سے اہل تشیع اپنے مخصوص اور نعوذ باللہ باطل نظریات کی وجہ سے الگ ہو گئے ،متعصب تاریخ نویسوں، راویوں اور دشمنانِ

۱۔ یادوں کی بارات۔ صفحہ ۲۰۹۔ از جوش ملیح آبادی۔ مطبوعہ مکتبہ شعروادب، چوھدری اکیڈمی، سمن آباد لاہور، مئی ۱۹۷۵

آل رسولؐ نے اپنا پراپیگنڈہ اس انداز سے پھیلایا کہ خود سادات بھی اس سے شدید متا ثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اسے کم علمی کہیے یا حالات کا وہ گھن چکر کہ جس نے اولاد کو ایسے نظریات کا مقلد بنا دیا جو اجداد کے عقائد سے نہ صرف مختلف ہیں بلکہ شدت سے متصادم ہیں، دشمنانِ آل رسولؐ نے گمراہ کن پر پیگنڈہ کے ذریعے نہ صرف اہل تشیع کا بانی عبداللہ ابن سبا کو بیان کیا بلکہ دین حقہ کو اسلام کے خلاف یہودیوں کی ایک سازش اور فتنہ قرار دیا، ان افسانہ تراشوں، متعصب مورخین اور درباری ملاوں نے حالات و واقعات کو اتنا مسخ کیا کہ اسلام کی حقیقی خصوصیات، نظریات، اور مقاصد گم ہوکر رہ گئے، اس دین کی تبلیغ وتشریح کی امین اولادِ رسولؐ اور اُن کے محبان پر زمین تنگ کر دی گئی۔ باطل نظریات کے سامنے سر نہ جھکانے پر حق پرستوں کو سرے عام ظلم و جور کا نشانہ بنایا گیا، ستم بالائے ستم یہ کہ اس ظلم کو چھپانے کی سر توڑ کوششیں ہر زمانے میں جاری رہیں جس کے نتیجہ میں آلِ رسولؐ سے روا رکھا جانے والا سفاکانہ طرز عمل اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل ہوکر رہ گیا، لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جن پاک باز ہستیوں نے مختلف ادوار میں تبلیغ دیں کا فریضہ انجام دیا اُن کی اکثریت سادات تھی جس کا ثبوت پاک و ہند کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ان کے مزارات ہیں، ان ساداتِ کرام نے اپنے مشن کے سامنے کسی دشواری اور مشکل کو بھی حائل نہیں ہونے دیا، شاطرین نے ان اولیاء اللہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے کی کوششیں جاری رکھیں اور اُنہیں تصوف و طریقت کے مختلف سلسلوں سے وابستہ کر کے اپنی دوکانیں چمکائیں، حالاں کہ یہ اولیاء اللہ تصوّف وسلوک کے کسی بھی سلسلہ سے حقیقتاً اس طرح منسلک نہ تھے جس طرح انہیں پیش کیا گیا، وہ تو فقط محبانِ اہل بیتِ رسولؐ تھے۔ جو حضورؐ کے دین پر عمل پیرا اور اس دین کے شارح تھے، ان میں سے کچھ شخصیات کو بہر حال اکثریت کے ظلم وستم سے بچنے اور حقیقی دینی تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچانے کے لئے

اپنے آپ کو ظاہری طور پر تصوف سے منسلک کر کے تقیہ اختیار کرنا پڑا۔

تاریخی کتب میں فرقہ واریت اور تعصبیت کا عنصر ہر جگہ غالب نظر آتا ہے، اسلام کے دیگر تمام فرقے ایک دوسرے سے دست و گریبان تو ہیں ہی مگر اہل تشیع کے خلاف ان میں کمال یگانگت پائی جاتی ہے، ان کی کتب میں کہیں بھی اہل تشیع کا مناسب الفاظ میں علمی دیانت داری کے ساتھ تعارف نہیں پیش کیا گیا، جانب دار مورخین نے منفی اندازِ نگارش اختیار کیا اور شیعان اہل بیت کو مطعون ٹھہرا کر تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا اور ساری مثبت باتوں کو اپنی فقہ کے پیروکاروں کا مرہون منت قرار دیا، جہاں مصنف کو کسی شیعہ شخصیت کا ذکر کرنا پڑا وہاں تاریخ کو مسخ کرنے کی غرض سے اُسے اپنے ہی فرقہ سے منسلک لکھ دیا گیا، لہٰذا سید علی ہمدانی اور قائداعظم محمد علی جناح سمیت دیگر بہت سی شیعہ شخصیات کتب تواریخ میں سنی العقیدہ نظر آتی ہیں، ایک دوسری وجہ سادات و محبانِ اہل بیت کا اکثریت کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے تقیہ اختیار کئے رکھنا ہے، ان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ خلافت کو منصوص من اللہ سمجھتے تھے اور انتخابی یا شورائی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اس ضمن میں ایک شیعہ محقق علی حسین رضوی لکھتے ہیں

> ’’پچھلی کئی صدیوں سے جو تاریخی کام کیا گیا ہے اس میں ہمارا (اہل تشیع کا) کوئی ذکر نہیں ہے اور شخصیات میں سے تو ہم کسی کو شیعہ کہہ ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ سب کے سب تقیہ میں زندگیاں گزارتے چلے گئے۔‘‘ (۱)

تقیہ کی آڑ میں سادات اور دیگر محبانِ اہل بیت کی نسلیں گزر گئیں مجبوری کے اس سفر میں

۱۔ تاریخ شیعان علی۔ سید علی حسین رضوی۔ صفحہ ۹۔

کئی باپ اپنے بیٹوں کو بھی نہ بتا سکے کہ ان کا عقیدہ کیا ہے، سیّد عیسیٰؒ کے متعلق ایک واقعہ مولانا نجم الحسن کراروی نے بیان کیا ہے، سیّد عیسیٰؒ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فرزند سیّد زید شہید کے بیٹے تھے، مولانا کراروی لکھتے ہیں:

''خلیفہ وقت اُن کے خون کا پیاسا تھا، آپ اپنا حسب نسب ظاہر نہ کر سکتے تھے اور خلیفہ جائر و جابر کی وجہ سے روپوشی کی زندگی گزارتے تھے، کوفہ میں آبپاشی کا کام شروع کر دیا تھا اور وہیں ایک عورت سے شادی کر لی تھی اور اُس سے بھی اپنا حسب ونسب ظاہر نہیں کیا تھا، اس عورت سے آپ کی ایک بیٹی پیدا ہوئی، جو بڑی ہو کر شادی کے قابل ہوگئی، اسی دوران میں آپ نے ایک مالدار بہشتی کے وہاں ملازمت کر لی جس کے ایک لڑکا تھا، مالدار بہشتی نے جناب عیسیٰ کی بیوی سے اپنے لڑکے کا پیغام دیا، جناب عیسیٰ کی بیوی بہت خوش ہوئی کہ مالدار گھرانے سے لڑکی کا رشتہ آیا ہے، جب جناب عیسیٰ گھر تشریف لائے تو اُن کی بیوی نے کہا کہ میری لڑکی کی تقدیر چمک اُٹھی ہے کیونکہ مالدار گھرانے سے پیغام آیا ہے، یہ سُننا تھا کہ جناب عیسیٰ سخت متفکر ہوئے، بالآخر خدا سے دُعا کی، بارالھا سیّدانی غیر سیّد سے بیاہی جا رہی ہے، مالک میری لڑکی کو موت دے دے، لڑکی بیمار ہوئی اور دفعتہً اُسی دن انتقال کر گئی، اُس کے انتقال پر آپ بہت رو رہے تھے، ان کے ایک دوست نے کہا اتنے بہادر ہو کر آپ روتے ہیں اُنھوں نے فرمایا کہ اس کے مرنے پر نہیں رو رہا، میں اپنی اس بے بسی پر گریہ کر رہا ہوں کہ حالات ایسے ہیں کہ میں اس سے یہ تک نہیں بتا سکا کہ میں سیّد ہوں اور

تو سیّد زادی ہے۔'' (۱)

سادات ومحبانِ اہل بیت کی مشکلات اور مسلسل نقل مکانی کو سمجھنے یا اس کی شدّت کا اندازہ لگانا آسان نہیں خصوصاً ایک ایسے ماحول میں جہاں تاریخ اور روایات کو مسخ کر دیا گیا ہو، جس شخص میں اس طوفانی سمندر میں اترنے کا دم ہے اُسے پہلے نہ صرف موروثی اور متذبذب عقائد سے پیچھا چھڑانا ہوگا بلکہ اسلام کے بنیادی عقائد وتصورات کو عقل اور ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں سمجھنا ہوگا، میرے نزدیک اسلام میں جمہوریت کا کوئی عمل و دخل نہیں کیونکہ دین کا کوئی بھی قانون اکثریت کے بل بوتے پر تبدیل یا منسوخ نہیں کیا جا سکتا، جب تک جمہوری اسلام سے پیچھا نہ چھڑا یا جائے تاریخ کے اس چودہ سو سالہ درد کے سفر کا حقیقی ادراک نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ سے شروع ہونے والا اختلافِ امت اور بعد از ''خلافتِ راشدہ'' ملوکیت کی بالا دستی نے دین کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا، بنی اُمیہ اور بنی عباس کے دور میں شورشوں نے مزید عروج پکڑا اور اقتدار کی مضبوطی کے لئے ظلم و بربیت کا ہر حربہ آزمایا گیا اور حق کو مہجور و مستور کرنے کے لئے ہر ممکن جتن کئے گئے، اولادِ حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا اور محبان اہل بیت کی نسلوں پہ نسلیں تہہ تیغ کی گئیں مگر اُن کو اپنے عقیدے اور حق سے متزلزل کرنے کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہوئی، جہاں اہل حق کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی اُنھوں نے اُس سرزمین کو ہی خیر باد کہہ دیا، جو ہجرت نہ کر سکے یا کسی محفوظ مقام تک نہ پہنچ سکے اُنھوں نے تقیہ کا سہارا لے کر وقتی طور پر زیر زمین چلے جانے میں عافیت سمجھی، مخالفین یہ جانتے تھے کہ جب تک منصبِ خلافت کے اصل حقدار یا کم از کم یہ مطالبہ کرنے والے موجود ہیں اُن کا اقتدار محفوظ نہیں، لہٰذا ہر دور

۱۔ چودہ ستارے، از مولانا سید نجم الحسن کراروی

میں مشقِ ستم جاری رکھی گئی۔

''بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہوتا رہا لیکن علیؑ کے پیرووں پر کوئی اثر نہیں پڑا، وہ ہر ذہنی تغیر سے بے نیاز ایشیا اور افریقہ کے مختلف گوشوں میں زندگی کی سانسیں لیتے رہے، موسم بار بار بدلے مگر انہوں نے صرف اس سورج کی روشنی سے حرارت لی جو فاطمہ زہراؑ کے گھر سے طلوع ہوا تھا، جس کی حدت میں الٰہیات کا فلسفہ بھی تھا اور طبعیات و کیمیا کی روشنی بھی لہٰذا جہاں انہیں کچھ موقع ملا، وہاں انسان اور انسانیت کی خدمات انجام دیں اور توحید کے پیغامات بھی سنائے، کبھی علی الاعلان اور کبھی چہروں پر تقیہ کے نقاب ڈال کر......!'' (۱)

حقیقی دین کی تبلیغ کے لئے سادات نے تعلیماتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، افکار اور روایاتِ آئمہ معصومین علیہم السلام کو کسی نہ کسی صورت زندہ رکھا، وہ صبر کے اس نہ تھمنے والے امتحان میں ہمیشہ سرخرو رہے دور بدلتے رہے اور نئے سرفروش جنم لیتے رہے، سادات اور محبانِ اہل بیتؑ اطہار قتل پر قتل ہوتے رہے مگر یہ رب العرش العظیم کی عنایت ہے کہ ان کی تعداد ہر زمانے میں بڑھتی ہی گئی، انہوں نے اوران کے محبان نے کبھی بھی دُنیاوی جاہ وحشم کے لئے اپنے دین کو نہیں بیچا جہاں ظلم وستم حد سے بڑھا انھوں نے بستر سمیٹا اور نقل مکانی کر گئے، دشت وصحرا پاٹنے کے بعد جہاں کہیں معروف وغیر معروف قریہ وبستی ملی وہیں بسیرا ڈالا اور علی علی کرنے لگے، سرزمینِ پاک وہند میں ہندو پنڈتوں، بھکشوں، رشیوں، اور بدھ مت کے پیروکاروں نے انھیں اوتار سمجھا، ان میں سے جس

ا۔ تاریخ شیعان علی۔ سید علی حسین رضوی۔ صفحہ ۵۰

نے اسلام قبول کیا اُس نے سادات کو عزت وتکریم کی سیج پر بٹھایا، اہل تصوف نے ان سادات کے عقائد کے بجائے کرامات پر نظر کی اور فقیر اور مجذوب سمجھ کر اپنے سلسلوں سے جوڑنا شروع کر دیا، چونکہ یہ اپنے منہ سے عقیدے کا برملا اظہار نہ کرتے تھے لوگوں نے انہیں ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے دیکھا تو شافعی مکتبہ فکر سے تعبیر کر دیا اور جس کسی کی سمجھ میں یہ معاملہ نہ آیا اُس نے یہ کہہ دیا کہ اولیا اللہ نہ تو سنی ہوتے ہیں اور نہ ہی شیعہ۔

تاریخ، احادیث، اور روایات کو ذاتی مفادات کے لئے مسخ کرنے کی مہم جو بنی اُمیہ کے دور میں اپنے عروج پر تھی ابھی تک جاری ہے، اس مہم نے سادات کے بہت سے گھرانوں کو اپنی حقیقی تاریخ و حقائق سے ناآشنا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، سادات کے بعض گھرانے اپنے اجداد کے عقائد سے آج بھی بے خبر ہیں، ان گھرانوں کے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اسلاف کے عقیدے سے منسلک ہیں، اس کی بنیادی وجہ اسلاف کی تاریخ و حالاتِ زندگی سے ناواقفیت ہے، ان میں سے بعض گھرانوں میں سلسلہ نسب پر خصوصی توجہ رہی اور ساری توانائیاں شجروں کے اندراج، ترتیب، اور چھان بین پر ہی مرکوز رہیں، اسلاف کے حالات و واقعات اور اُن کے حالاتِ زندگی پر توجہ سرے سے تھی ہی نہیں، یا پھر چند افراد کے سوا کسی نے اس پر کام نہیں کیا، جو حالات میسر آئے وہ سینہ بہ سینہ بیان ہوتے رہے مگر کتابی شکل میں کربلا کے اس تسلسل کو پیش کرنے کی کاوش کا فقدان رہا، چنانچہ اجداد کی تاریخ کا ایک بڑا حصّہ ضائع ہو گیا، ممکن ہے کچھ قلمی نسخے ابھی بھی دیمک کی دست بُرد اور موسمی شکست و ریخت سے بچ گئے ہوں مگر کوئی بھی ان انمول نسخوں پر جمی ہوئی گرد جھاڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا۔

زیرِ نظر کتاب کوئی فکشن نہیں بلکہ پیغمبر اسلام سے نسلی وابستگی رکھنے والے افراد کی دین اور اہل بیت سے وابستگی اور بیش بہا قربانیوں کا ایک جاں گداز تذکرہ ہے، اس طرح کے نہ جانے کتنے تزکرے سینیوں اور تاریخی کتب میں مدفن ہوں گے، یہ سب درحقیقت

کرب و بلا کا تسلسل ہیں جو بعد از وصالِ نبیؐ شروع ہوا، دشتِ نینوا میں اپنے عروج کو پہنچا اور ظہورِ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف تک جاری رہے گا، اس تزکرہ کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کرتے ہوئے میں نے کوشش کی ہے کہ کتاب میں ابواب کی ترتیب کو اس طرح رکھا جائے کہ شروع سے آخر تک ربط و تسلسل برقرار رہے اور ایک مربوط مطالعہ اربابِ فکر ونظر کو پیش کیا جا سکے، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی قارئین ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

ایک دوسرا پہلو جو اس کتاب میں زیرِ بحث آیا ہے وہ تصوف سے متعلق ہے، تصوف کو میں طریق اسلام نہیں سمجھتا، ممکن ہے بہت سے قارئین کے لئے یہ بات حیرت و ناپسندیدگی کا باعث ہو تاہم میرا یہ نظریہ صرف وہم، قیاس، یا پھر محض عقیدے کی بنیاد پر نہیں ہے، میں نے کتاب کے دوسرے حصّے میں منطقی اور تاریخی دلائل کی ساتھ تصوّف کی حقیقت بیان کی ہے، اُمید ہے کہ یہ ذہنوں کے بند دریچے کھول کر تازہ ہوا کے جھونکے فراہم کرے گا، یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ ہمارے جتنے بھی اسلاف گزرے ہیں اُنھیں زبردستی یا لاعلمی کی وجہ سے مختلف سلسلہ ہائے تصوّف سے منتھی کیا جاتا ہے، ان بزرگوں نے خود کبھی بھی تصوّف و طریقت کی طرف داری نہیں کی، ان اسلاف میں حضرت معین الدین اجمیری (المعروف خواجہ معین الدین چشتی)، حضرت لعل شہباز قلندرؒ، حضرت حسین محمد ولیؒ از پکھلی، حضرت شاہ لطیفؒ (المعروف بری امام سرکار)، حضرت محمود شاہؒ (والد گرامی حضرت بری امام) حضرت پیر تقی شاہؒ، حضرت بابا شاہ زینؒ (زین العابدین مزار ادھڑ وال چکوال)، حضرت شاہ عنایت ولی (مظفرآباد شہر) حضرت سید معظم شاہؒ (چاہاری راولپنڈی)، سید شاہ مزمل (پھیکہ سیداں سیکٹر F-11 اسلام آباد) حضرت شاہ چن چراغؒ (راولپنڈی)، حضرت سخی شاہ نذر دیوانؒ (سید کسراں چکوال)، حضرت شاہ جہاں بادشاہؒ (شاہ دیاں ٹالیاں راولپنڈی) حضرت بابا شاہ پیاراؒ (چوہڑ پال

راولپنڈی) شامل ہیں، یہ تمام بزرگ نسباً کاظمی سادات تھے اور دین اسلام کی ترویج میں ان کا کردار کسی تعارف کا محتاج نہیں، یہ سب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے بارہ معصوم اور منصوص من اللہ نائبین کی تعلیمات کی روشنی میں تبلیغِ دین کرتے رہے ہیں لیکن آج ان بزرگوں کے مزارات پر لگی ہوئی چشتی، قادری، نقشبندی، قلندری، کُبروی اور دیگر سلسلہ ہائے تصوّف کی تختیاں اُن کی اصل حقیقت کو چھپائے ہوئے ہیں۔

مجھے اپنی علمی قابلیت اور تحقیقی قد و قامت کا بخوبی اندازہ ہے اور اس کتاب کے موضوع کی وسعت کا بھی، اس کتاب کے ذریعے میں کسی بھی قسم کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن یہ خواہش ضرور رکھتا ہوں کہ میری یہ کوشش نوجوان سادات و مومنین میں جذبہ تحقیق کو اُجاگر کرے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہارؑ اس کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت بخشیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلُ مِنَّا اِنَّكَ اَنُتَ السَّمِیُعُ الُعَلِیمُ

سیّد آفتاب حسین کاظمی

مدینۃ العین- ابوظہبی

20 ستمبر 2006ء

حصّہ اوّل

انسان اورفطری ہدایت

زندگی ایک معمہ ہے جو صدیاں بیت جانے کے بعد آج بھی اپنے اسرار سے پردہ اُٹھائے جانے کی متلاشی ہے، دُنیا کے تمام مذاہب، فلسفے، علماء اور جدید سائنسدان انسان کو کرہٗ ارض میں پائی جانے والی زندگی کی تمام شکلوں اور قسموں میں سب سے ممتاز اوراعلیٰ قرار دیتے ہیں، اس اقرار کے باوجود سائنسدان انسانی زندگی کی تخلیق کو زمین پر پائی جانے والی دیگر زندہ اشیاء سے الگ تصور نہیں کرتے، مشہور زمانہ سائنسی نظریہ ارتقاء(Theory of Evolution) سائنسدانوں کے خیالات کا مظہر ہے، اس نظریہ پر گزشتہ کئی دھایوں سے مغرب ومشرق میں مسلسل بحث وتحقیق ہورہی ہے، لیکن اس کے برعکس اسلام، یہودیت، اورعیسائیت انسان کی مکمل حالت میں تخلیق کو مانتے ہیں۔

نظریہ ارتقاء پر اختلافِ رائے بہرحال آج بھی موجودہ ہے، سائنسدانوں کا ایک گروہ اس نظریہ کو یکسر مسترد کرتا ہے، کچھ لوگ اگرچہ اس نظریہ سے اتفاق نہیں رکھتے مگر اس کو قابلِ غور سمجھتے ہیں، جو لوگ اس نظریہ سے متفق ہیں وہ اس کی حمایت میں علمی اور مشاہداتی دلائل پیش کرتے ہیں لیکن اس حقیقت کو بھی مانتے ہیں کہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں جو مزید تحقیق و بحث کا تقاضا کرتی ہیں، یہ لوگ اس یقین کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ یہ خامیاں آخرِ کار دور کی جاسکتی ہیں، یہاں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کے

سائنس کا عمومی مفہوم علم کا ہے مگر مغرب میں اس سے مراد وہ علم ہے جو فقط مشاہدے اور تجربہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اسلام میں علم کی اصطلاح بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔

زندگی کے بارے میں انسانی تجسس ایک حقیقت ہے، انسان اس کی پُراسراریت کو کھوج کر چند سوالات کا جواب چاہتا ہے، اُس کے ذہن میں یہ سوالات مسلسل گردش کر رہے ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ یہ کرۂ ارض پر کب اور کہاں سے شروع ہوئی؟ اگر کوئی خالق ہے تو وہ کون ہے؟ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ خالق کے وجود پر یقین نہ رکھنے والے مغربی ومشرقی سائنسدانوں کی صدیوں کی تحقیق اور مطالعے کے باوجود کوئی بھی یہ معمہ حل نہیں کر سکا کہ دُنیا میں زندگی کا بیج کہاں سے آیا، دُنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے اپنے نظریات سے فلسفہ اور مذہبیات کی کتابیں بھر ڈالی ہیں ان مفکروں میں بہت سے خُدا کے تصوّر کے منکر ہیں اور مذہب کو فضول یا بیکار شئے سمجھتے ہیں، مغرب کے ان لادین افکار کے پیچھے صدیوں کی وہ لڑائی ہے جو کلیساء اور ریاست کے درمیان جاری رہی، اس لڑائی میں آخرِ کار کلیساء کو شکست ہوئی اور لادین افکار نے انقلابِ فرانس کے بعد مغربی معاشرے کو چرچ کی حکمرانی سے آزاد کر کے اُس کے خدوخال کو ہی مکمل طور پر بدل ڈالا، اس تبدیلی میں کن مفکروں اور نظریات کا ہاتھ تھا اس کے لیے کتاب کے آخر میں تتمہ ملاحظہ فرمائیں۔

مغربی معاشرہ کے ان سحرانگیز نظریات کے برعکس مسلمان اللہ تعالیٰ اور قرآنِ مجید پر ایمان رکھ کر زندگی کی ابتداء اور اس کے مقصد کے بارے میں تمام تر الجھنوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں، قرآنِ مجید کی ایک چھوٹی سی آیت نہ صرف خالق اور مخلوق کا پتہ دیتی ہے بلکہ یہ بھی منکشف کرتی ہے کہ انسان سے بہتر کوئی مخلوق نہیں چنانچہ ارشادِ اللہ رب العزت ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِی أَحْسَنِ تَقْوِیمٍ

ترجمہ: ہم نے انسان کو بہت اچھی تقویم پر پیدا کیا (۱)

اس بنیادی جواب کے بعد اللہ تعالیٰ بطورِ خالق و مالک انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنی خِلقت پر غور و فکر کرے اور اُس مقصد کو حاصل کرے جس کے لئے اُس کی تخلیق عمل میں لائی گئی ہے، چنانچہ توحیدِ باری تعالیٰ، رسالتِ محمدؐ، اور قرآن پر ایمان سے مسلمان کو وہ واضح سمت مل جاتی ہے جس کے بغیر زندگی اور اس کے مقصد کے بارے میں تمام تر انسانی تحقیق فقط ظن، قیاس، تخمینوں، اور مفروضوں پر ہی انحصار کرتی نظر آتی ہے، دو پیروں پر استادہ انسان ایک خوبصورت، ذہین باشعور اور باصلاحیت مخلوق ہے اور اس حقیقت کو آج کے تمام سائنسی علوم بلا تفریقِ مذہب و معاشرت تسلیم کرتے ہیں۔

اس شاہکار مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام نعمتوں کے دروازے کھولے، اِسے حُسنِ ذوق و ادراک دیا تاکہ وہ کائنات میں حُسن و جمال اور رنگ و بُو کے انبار در انبار سے لطف اندوز ہو سکے، اللہ سبحان تعالیٰ نے صبح کے تڑکے میں طلسمِ حوش رُبا رکھا تو شام کی خامشی میں سکون و آشتی کو بھر دیا، کہیں گرتے جھرنے میں سحر انگیز جلترنگ بجتی ہے تو کہیں پھولوں کی خوشبو سے روح و بدن مہک اُٹھتے ہیں، نغمہ ہائے مرغان رگِ طرب کو چھڑتے ہیں تو کہیں معصوم بچوں کی قلقاریاں در و بام کو چہکا دیتی ہیں، کہیں دور پہاڑی مکان سے اُٹھتا ہوا شام کا دھواں گزرتے وقت کی طنابیں تھام لیتا ہے تو کہیں جھلستی دوپہر کوئیل کی کُوکُو سے اپنی شدت بُھلا بیٹھتی ہے، لیکن قدرت کی کرشمہ سازی پر مہرِ فقط کہیں ثبت ہوتی دِیکھائی نہیں دیتی، معبودِ حقیقی نے کائنات کے ظاہری حُسن پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک بھرپور باطنی حُسن بھی انسان میں جاگزیں کیا تاکہ وہ دونوں کے امتزاج سے فطرت و

۱۔ سورۃ التین (۹۵:۴)

قدرت کی رنگینیوں سے راحت وسکون حاصل کر سکے، جذبات و احساسات کا ایک بحر طلاطم انسان کی ہستی میں موجزن کیا اور اُس کی تسکین کے لئے رشتوں اور شفقتوں کی بہم رسانی کا ساماں بھی کیا، انسان کو وقتِ پیدائیش اگر سب مخلوقات میں ناتواں بنایا تو ماں کی اُس آغوشِ شفقت میں دینے کے لئے کہ جس کی گہرائی کا نہ تو کوئی اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ ہی اُسے ناپنے کا کوئی پیمانہ ایجاد کیا جا سکتا ہے، باپ کا شفیق سہارا بخشا جو اولاد کی ناتوانی کو توانائیوں سے بھرنے میں ممدور ہے اور اُس کی الفت میں سرشار مثلِ مگس خارزارِ زمیں میں خوشبو، شیرینی اور خوشی اکھٹی کرتا پھرے، قبیلوں اور نسلوں میں بانٹا کہ اُس کی پہچان اور نسلی خواص برقرار رہیں، اس سب کچھ کے باوجود اُسے تنہائیوں کا وہ رفیقِ باوفا بھی دیا کہ جس کے لئے بزبانِ شاعر وہ پکارتا پھرا کہ...

دیارِ نور میں تیرا شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو

جس طرح ہر ایجاد و تخلیق کا کوئی مقصد ہوتا ہے اسی طرح انسان کی بھی وجہِ خلقت ہے عقل اس بات کو ماننے کے لئے کسی طور تیار نہیں کہ اس کائنات اور انسان کو اللہ سُبحان تعالیٰ نے بغیر کسی منصوبے اور مقصد کے بنایا ہوگا، یہ منصوبہ کیا ہے؟ اسی منصوبہ کو سمجھنا اور اُس کے مطابق عمل کرنا ہی انسان کا فرضِ اولین و آخرین ہے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً ... (۱)

ترجمہ: خدایا تو نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔

۱۔ سورہ آل عمران ۳:۱۹۱

چونکہ تخلیقِ کائنات اسباب وعلل (cause and effect) کے اصول پر ہوئی ہے اس لئے انسان کو عقل، جسم، روح، جذبات، روحانی اور حیوانی طاقتوں اور دیگر صلاحیتوں سے مزّین کیا گیا ہے تاکہ وہ انہی طاقتوں کو بروئے کار لاکر راہِ حق کو سمجھے اور پھر اُس پر مضبوطی سے کاربند ہو جائے۔

جب اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت پر پختہ یقین ہو تو انسان اپنے وجود کو مشیتِ الٰہی سمجھتا ہے اور اپنے مالک کا شکر ادا کرتا ہے، اس کو اسلام میں مسئلہ قضا کہا جاتا ہے، دُنیا میں آنے کے بعد انسان نے کب تک باقی رہنا ہے اور کیا کرنا ہے اسے مسئلہ قدر کہا جاتا ہے، یہ دونوں مسائل انتہائی دقیق اور پیچیدہ ہیں تاریخِ اسلام ان مسائل پر مختلف بحثوں اور نظریوں سے بھری پڑی ہے، ایک زمانے میں اس مسائل نے اتنا زور پکڑا کہ مسلمانوں کے دو فرقے پیدا ہو گئے جو جبریہ اور قدریہ کے ناموں سے پکارے گئے، یہاں ان فرقوں پر بحث مقصود نہیں لیکن اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ انسان کی تخلیق قضا یا مشیتِ الٰہیہ ہے اور اس کے فکر و عمل کو جو کہ قدر ہے اس مشیت میں دخل حاصل ہے، انسان مجبور نہیں بلکہ اپنے قول و فعل میں اختیار رکھتا ہے اور اسی پر اسلام کا فلسفہِ جزا وسزا اور یومِ حساب استوار ہے، ارشادِ اللہ رب العزّت ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً (١)

ترجمہ: ہم نے اس (انسان) کو راستہ دکھا دیا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

دُنیا درحقیقت ایک جائے امتحان ہے اسی لئے انسان میں نفسانی خواہشات پیدا کی گئی

١۔ سورۃ الدّھر (٧٦:٣)

ہیں اور شیطان اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے، چونکہ انسان کو بوجہ روح و عقل اشرف المخلوق کا درجہ ملا ہے اس لئے اُس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ تمام تر بہکاؤں کو مات دے کر حق پر قائم رہ سکے، بدی کی طاقتوں کی اس دُنیا میں موجودگی کا اصل جواز یہ عقل ہی ہے جس کا یہ لازمہ ہے کہ فیصلہ کرے، فیصلہ ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں یا امکانات میں کیا جاتا ہے لہٰذا خیر وشر کی تخلیق اسی قوتِ فیصلہ کو استعمال میں لانے کے لئے کی گئی اگر فقط نیکی ہی نیکی ہوتی تو عقل کی ضرورت ہی کیوں ہوتی اس کی واضح مثال فرشتہ ہے جو بدی کی طاقت اور عقل دونوں نہیں رکھتا، اُس کی تخلیق کی وجہ اطاعتِ ربانی ہے جس میں اُسے نہ تو کوئی فیصلہ کرنا ہے اور نہ ہی اختیار رکھتا ہے کہ اپنی غرضِ خلقت سے سرِ منہ انحراف کر سکے، یہاں یہ مدِ نظر رہے کہ تخلیقِ آدم کے وقت اللہ نے فرشتوں کو وقتی طور پر اختیار ودیعت کر کے دین اسلام کے چند اصولوں کا اعلان کیا تھا جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان ہی اصولوں سے انحراف نے انسانوں کی ایک واضح اکثریت کو مثلِ شیطان جہالت و گمراہی کی دلدل میں دھکیل رکھا ہے، چنانچہ یہ لازم ہے کہ انسان اپنی عقل کو استعمال میں لائے اور خود فیصلہ کرے کہ درست کیا ہے اور غلط کیا ہے۔

تخلیقِ آدم فطرت کے تقاضوں پر ہوئی ہے اور اُسے پیدا کر کے چھوڑ دینے کے بجائے اللہ تعالٰی نے اُسے گمراہی سے بچانے کے لئے فطری ہدایت کا انتظام کیا تا کہ وہ شیطان ونفس کی چیرہ دستیوں کا بھرپور مقابلہ کر سکے، ہر مسلمان کم از کم زبانی طور پر یہ اقرار تو بہر حال کرتا ہی ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے بسا اوقات اس بات کو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان بھی کیا جاتا ہے مگر مسلمانوں کی ایک اکثریت اس کو عقل وفکر کے ساتھ نہ تو سمجھتی ہے اور نہ ہی قرآن وحدیث کی درست تشریحات کی روشنی میں اس کو پرکھتی ہے، عوام الناس اس اہم فکری نکتہ پر محض زبانی جمع خرچ تک ہی محدود ہیں، دین اسلام ایک آسان اور مکمل مذہب وضابطہ ہے جو انسان کی مادی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا

ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بغیر عقل وفکر اس پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے، اس دین کی درست سمجھ اور اس کی تعلیمات پر عمل ہر مسلمان کا فریضہ ہے، سمجھ کے بغیر عمل کی دُرستگی کی کوئی ضمانت نہیں اور پھر ناقص عمل سے اسلام کے جسمانی، روحانی، دُنیاوی اور اُخروی فیوض و برکات کا حصول کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ دینِ اسلام کا مقصد جنت کی لالچ میں یا دوزخ کے خوف سے انسان کو عبادت پر مجبور کرنا ہرگز نہیں اور نہ ہی خوف اور لالچ یا حالتِ مجبوری کی عبادت پروردگار کی منشاء ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ انسان کو اختیار نہ دیتا اور وہ دیگر مخلوقات کی طرح بغیر اختیار کے صبح شام اپنے ربّ کی تسبیح میں مشغول ہوتا، ایسی حالت میں انسان کی تخلیق کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی، کیونکہ ما سوائے انسان کے ساری مخلوقِ خُدا عقل کے بغیر بھی باطریقِ احسن عباداتِ الٰہیہ کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

عبادت کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ کہ جس کی خود انسان کو ضرورت ہے، دوسری وہ کہ جس کی بجا آوری کے لئے کسی علم وعقل کی ضرورت نہیں جیسے فرشتے، حیوانات، جمادات اور نباتات اس کو بجالا رہے ہیں، اور تیسری قسم وہ کہ جو مقصدِ تخلیقِ انسان ہے، موخر الذکر عبادت عقل اور علم وفکر کے بغیر ادا نہیں کی جا سکتی، اسے صرف انسان ہی بجالا سکتا ہے اور یہ ہی اُس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات بھی تین بنیادی اقسام میں منقسم ہیں یعنی عقائد (Doctrines)، اخلاقیات (Morals)، اور احکامات یا قوانین (Laws). ان تینوں اقسام سے بحث کرنے والے علوم کو علم کلام، علم اخلاق، اور علم فقہ کہا جاتا ہے، لہٰذا یہ تینوں بنیادی علوم ہوئے اور دیگر تمام علوم سے اسلام کی تشریح وتفسیر میں استفادہ کرنا عقل وفہم کا تقاضہ ہے، ان تینوں علوم کے ذیل میں انگنت جدید وقدیم علوم آتے ہیں اور اسی وجہ سے اسلام علم کے جامع نظریہ پر یقین رکھتا ہے، اہل سنت کے مولانا طاہر القادری کا کہنا ہے کہ قاضی ابوبکر

بن عربی نے اپنی کتاب قانون الزاوِیل میں ابتدائی طور پر قُرآنی علوم کی تعداد ۷۷،۴۵۰ بیان کی ہے، قُرآنِ مجید میں استعمال ہونے والا ہر کلمہ یقیناً کسی نہ کسی مستقل علم اورفن کی بنیاد ہے، گویا ہر قرآنی حرف سے کوئی نہ کوئی علم اور فن جنم لے رہا ہے، شومئی قسمت کہ علمائے سُو نے دین کے خودساختہ چربے پر اپنی ٹھیکیداری، اور جہالت پر پردہ قائم رکھنے کے لئے علم کو دُنیاوی اور اسلامی قسموں میں تقسیم کررکھا ہے، اُن کے نزدیک اسلامی علم صرف بغدادی قاعدے اور نماز روزہ کے مسائل تک ہی محدود ہے اور باقی تمام جدید و قدیم علوم دُنیاوی ہیں، بدقسمتی سے مسلمانوں کی اکثریت ان علماء کی بے چوں و چراں تقلید کرتی چلی آرہی ہے نتیجہ آپ کے سامنے ہے، آج مسلمان تعلیم، اقتصادیات، سیاسیات، اور دفاع سمیت دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی میں غیرمسلم اقوام کے دستِ نگر ہوکر رہ گئے ہیں، حیرت ہے کہ مسلمان ہرروز لہک لہک کر قرآن کی تلاوت کرتے ہیں مگر اس حقیقت سے نابلد ہیں کہ یہ ہی کلامِ مبین عقیدے اور ایمان کی بنیادیں علم اور غوروفکر پراستوار کرتا ہے،

بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۱)

ترجمہ: (ان پیغمبروں کو بھیجا بھی تو) روشن دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ اورتمہارے پاس قرآن نازل کیا ہے تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم ان سے صاف صاف بیان کردو تاکہ وہ لوگ خود سے غوروفکر کریں۔

۱۔ النحل ۱۶:۴۴

اسلام علم اور غور و فکر کا راستہ ہے اور اس کے سوا دُنیا کے کسی مذہب اور نظریہ نے علم کی اہمیت پر اتنا زور نہیں دیا، نا سمجھی اور بے علمی کی عبادت اور جہالت پر مبنی کوئی بھی عمل یا عبادت نہ تو معرفتِ الٰہیہ کی منزل پر لے جاتی ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ڈر دلوں میں پیدا کر کے جہالت میں ڈوبے ہوئے افراد کو غلط کاریوں سے روک سکتی ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا ہے کہ علم و عقل والے ہی اُس کا ڈر رکھتے ہیں،

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (۱)

ترجمہ: اللہ سے تو اُس کے بندوں میں سے علم والے ہی ڈرتے ہیں.

یہ امر قابلِ غور ہے کہ انسان کی تخلیق کے بعد اُسے مسلسل ہدایت فراہم کی جاتی رہی ہے جو انبیاء کے ذریعے مختلف آسمانی صحائف کی شکل میں آتی رہی، اس ہدایت کا مقصد صرف اور صرف انسان کو کائنات کی تخلیق کے اُس منصوبہ تک لے جانا ہے جو اللہ تعالیٰ کی منشاء ہے، قرآنِ مجید کی مختلف آیات میں بظاہر مختلف مگر ایک ہی جیسے چند احکامات آئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کا منصوبہ کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ (۲)

ترجمہ: ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح و روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور ترازو نازل کی تا کہ لوگ انصاف

۱۔ الروم،۳۰:۲۲

۲۔ الحدید ۲۵:۵۷

(یعنی عدل) پر قائم رہیں

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (۱)

ترجمہ : اور اللہ ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا (جب) تم بالکل ناسمجھ تھے اور تم کو کان دیے اور آنکھیں (عطا کیں) دل (عنایت کیے) تا کہ تم شکر کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۲)

ترجمہ: اور ہم نے ہر اُمت میں ایک (نہ ایک) رسُول ضرور بھیجا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کی عبادت کرو اور بتُوں (کی عبادت) سے بچے رہو.

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳)

۱۔ سورۃ النحل ۱۶:۷۸

۲۔ سورۃ النحل ۱۶:۳۶

۳۔ سورۃ النحل ۱۶:۴۹

ترجمہ: جتنی چیزیں (چاند سورج وغیرہ) آسمانوں میں ہیں اور جتنے جانور زمین میں ہیں سب خُدا ہی کے آگے سربسجود ہیں اور فرشتے تو (ہیں ہی) اور وہ حُکم خدا سے سرکشی نہیں کرتے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں انسان کو بظاہر چار باتوں کا حکم دیا گیا ہے جو کہ مقصد تخلیقِ انسان ہیں یعنی عدل پر قائم ہونا، پروردگار کا شکرگزار ہونا، کائنات کی ہر چیز کی طرح مسلمان ہونا، اور عبادت کرنا، اللہ تعالیٰ کی تمام انبیاء کرام اور کتابوں کے ذریعے انسان تک پہنچنے والی ہدایت فقط ان ہی باتوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے، ان چاروں باتوں کو اگر قرآنی تعلیمات اور سیرتِ نبیؐ اور آئمہ طاہرینؑ کی راہنمائی میں دیکھا جائے تو سب کا مقصد ایک ہی ہے گویا یہ چاروں باتیں الگ نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں ہیں جنھیں دیکھنے والوں کے زاویہ نگاہ کی خاطر الگ الگ بیان کیا گیا ہے، لہٰذا جب آپ اس آیہ مبارکہ کو دیکھتے ہیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کائنات کا زرہ زرہ اللہ کی تسبیح و عبادت کررہا ہے تو یہ بات طے ہے کہ یہ زرہ زرہ مسلمان ہے، اس طرح کائنات کی یکتائی سے منسلک ہونے کے لئے انسان کے لئے جو ہدایت دی گئی وہ دینِ اسلام ہے، اس ہدایت کو جب معاشرے کی نسبت سے دیکھا جائے تو عدل ہے، انسان خود اپنی نسبت سے دیکھے تو یہ عبادت ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہ شُکر ہے۔ یہ ہی وہ منصوبہ ہے کہ جس کی خاطر انسان کو خلق کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان اعتدال اور فطرت پر رہتے ہوئے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے مؤثر استعمال سے فہم و فراست کو جلا بخشے اور کائنات کے اسرار و رموز دین کی روشنی میں بے نقاب کرتا چلا جائے کیونکہ جیسے جیسے وہ کائنات کو غور و فکر اور تحقیق سے مسخر کرتا جائے گا وہ سمجھتا جائے گا کہ اتنی عظیم الشان کائنات کا خالق کتنا عظیم ہے۔

اسلام کے اس حقیقی مقصد کو بد قسمتی سے ایک اکثریت نے نہ سمجھا، اوئل اسلام میں بعض لوگوں پر زمانہ جہالت کا ذاتی اغراض، لالچ اور دُنیا داری کا غلبہ برقرار رہا، وہ یہ نہ جان سکے کہ دین حمید ریا کاری اور نفسانی خواہشات سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتا، یہ دونوں عوامل نفسِ امارہ کے تابع ہیں جب تک ان پر مکمل قابو نہ ہوا انسانی فکر و عمل پر شیطان کا غلبہ رہتا ہے اور آدمی پر اسلام کا مکمل اور درست اثر و نفوذ نہیں ہوتا۔ جہالت، لالچِ دُنیا، اور خوف کے زیر اثر انسان صدیوں سے جانوروں، پتھروں، سورج اور چاند ستاروں کو خدا مانتا آیا ہے، اسی طرح علم و ایمان کے فقدان کی وجہ سے لوگوں نے اسلام میں اپنی مرضی کو رواج دیا اور اسے مرضیِ خدا سے تعبیر کر کے مسلمانوں کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا، اسلام قبول کرنے کے باوجود ان افراد کے دلوں میں خواہشاتِ دُنیاوی کا غلبہ رہا، ان میں اصحابِ رُسولؐ بھی تھے، تابعین بھی اور تبع تابعین بھی، یہ ہی لوگ درحقیقت اُمتِ محمدی میں نفاق کے پیش رو بنے۔

ایک وقت آیا کہ بڑھتا ہوا نفاق، شورشیں اور بے ہودگیاں عترتِ رسولؐ کو کربلا کے بے آب و گیاہ دشت میں دھکیل کر لے گئیں، اہل بیتِ رسولؐ کو بے دردی سے قتل کیا گیا، مستوراتِ عصمت کے سروں سے چادریں چھنیں گئیں، جسمانِ جگر گوشہِ بتولؑ پر گھوڑے دوڑائے گئے، بچوں اور حرم رسولؐ کو بے کجاوہ اونٹوں پر سینکڑوں میل کی مسافتیں طے کروائیں گئیں، اور پھر ہر دور میں اہل بیتِ رسولؐ اور ان کے حُب داروں کو تختہ دار پر چڑھایا گیا، دیواروں میں زندہ چنوایا گیا اور قید و بند کے مصائب و آلام سے دوچار رکھا گیا، کیا تاریخ نبی زادوں کا سینوں پر برچھیاں کھانا، نشانہِ تیرِ ظلم بننا، گھوڑوں کے پاؤں سے روندا جانا، زہرِ ہلاہل سے دل و جگر کے ٹکڑے اُگلنا، اور زندانوں اور تنہائیوں میں جان دینا بھلا سکتی ہے؟ کیا زمانہ بنو اُمیہ اور بنو عباس کی اُن کوششوں کو چھپا

۱۔سورۃ یٰسین :۲۳: ۳۶

سکا ہے جو اُنھوں نے زمین کو آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود سے خالی کرنے کے لئے کیں؟ یہ کفار و مشرکین نہیں بلکہ مسلمان ہی تھے جو دُنیاوی اقتدار پر قابض اور دین کے ٹھیکیدار بن بیٹھے تھے، بغض علیؑ اور اولادِ علیؑ میں اسلام کو ہی پسِ پُشت ڈال دیا گیا، اس صورتِ حال میں نئی نسل تک جو دین پہنچا اُس کا نام تو اسلام ہی رہا لیکن اُس کی شکل اتنی بگڑ گئی کہ اُس کی اصل روح ایک اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر رہ گئی، نت نئی تبدیلیاں کی گئیں، دیگر مذاہب کے فلسفہ و افکار کی دین میں ترویج کی گئی، اور ایسی بدعتیں (مثلاً تصوف اور طریقت) رواج پا گئیں جو سراسر اسلام سے متصادم تھیں، یہ گمراہی درحقیقت دُشمنیِ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نتیجہ ہے کیونکہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے حکم کے مطابق اجرِ رسالت ادا کئے بغیر دین سے حقیقی استفادہ ناممکن ہے اور کشتیِ اہل بیتؑ سے کنارہ کش ہونے والوں کے مقدر میں ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا، کیا رسولؐ اللہ کی عمر بھر کی نیکی و مشقت کا صلہ مسلمانوں کے پاس یہ ہی ہے کہ اُن کی اولاد قیامت تک خون میں لت پت رہے، نہ اپنے حق کا تقاضہ کر سکے اور نہ ہی کوئی جائے امان پا سکے؟

ہمیں کس جرم میں امت نے کیا زندہ دفن
پوچھتے کون ہیں بغداد کے قید خانوں سے

انتہا تو یہ ہے کہ آلِ رسولؐ اور محبان اہل بیتِ نبیؐ کے خون سے جنت کا راستہ بنایا جا رہا ہے، اولادِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو خاک و خون میں نہلانے اور اُس کی حق تلفی کرنے والے قُرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کی موجودگی میں آخرت میں کس منہ سے شفاعتِ محمدی کی اُمید رکھتے ہیں:

قُـل لَّا أَسـأَلُكُم عَلَيهِ أَجراً إِلَّا المَودَّةَ فِيُ القُربَى وَمَن يَـقُتَـرِفُ حَسَـنَةً نَّـزِدُ لَـهُ فِيُـهَـا حُسُناً إِنَّ اللَّـهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (۱)

ترجمہ: (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابتداروں (اہل بیت) کی محبت کے سوا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا، اور جو شخص نیکی حاصل کرے گا ہم اس کے لئے اس کی خوبی میں اضافہ کر دیں گے، بے شک خُدا بڑا بخشنے والا قدردان ہے.

حافظ سید فرمان علی اعلی اللہ مقامہ اس آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشری، صحیح بخاری، مسند احمد بن حنبل اور درِ منشور سیوطی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''جو شخص میرے اہل بیتؑ پر ظلم کرے اور مجھے میری عترت کے بارے میں اذیت دے اس پر بہشت حرام ہے.'' (۲)

مَثَـلُ اَهـلُبَيُتَـىُ كَـمثَـلِ سَـفِيُنَةِ نُوُحٍ مَنُ رَكِبَهَا نَجىٰ وَ مَنُ تَخَلَّفَ عَنُهَا غَرِقَ وَ هَوَىٰ (۳)

ترجمہ: آگاہ ہو کہ میرے اہل بیتؑ تمہارے لئے کشتیِ نوح کی مانند

۱۔ سورۃ الشوریٰ ۴۲:۲۳

۲۔ قرآن مجید۔ ترجمہ از حافظ سید فرمان علی

۲۔ صحیح مسلم

ہیں جو شخص اس کشتی میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس میں سوار ہونے سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوا۔

صرف اس پر ہی اکتفا نہیں، کئی دیگر احادیثِ مبارکہ اہل بیت اطہارؑ کی شان میں وارد ہوئی ہیں، مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اپنی ایک شہرہ آفاق تصنیف میں حضرت زیدؓ بن ارقم سے روایت کرتے ہیں کہ:

''فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے کہ میں ایسی (دو) چیزیں چھوڑتا ہوں کہ اگر تم ان کو تھامے رہو گے تو کبھی میرے بعد گمراہ نہ ہو گے، اور ان میں ایک چیز دوسری سے بڑی ہے ایک تو کتاب اللہ کہ وہ رسّی ہے آسمان سے زمین تک اور میری عترت یعنی اہل بیتؑ اور ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض پر پہنچیں گے، سو ذرا خیال رکھنا کہ میرے بعد ان دونوں سے کیا معاملہ کرتے ہو۔'' (۱)

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَاباً مُّهِيناً (۲)

''بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قصداً ایذا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور

۱۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیبؐ۔ از مولانا اشرف علی تھانوی۔ صفحہ ۳۷۳ ناشران تاج کمپنی

۲۔ سورۃ الاحزاب ۳۳:۵۷

ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے‘‘

واقعہ کربلا کے بعد تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ اسلام کے مقابلے میں باطل نظریات کو یکجا کر کے جو مذہب اسلام کے لبادہ میں کھڑی کی گئی تھی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین نہیں بلکہ شاہی درباروں سے پیش کیا جانے والا ایک ایسا دستور تھا جس کا خمیر اہل بیت نبیؐ کی دشمنی سے اُٹھا تھا، وہ دین جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے تھے اُس میں عترتِ رسولؐ کا ایک اعلیٰ مقام ہے اور اُسے ہی مرکزِ دین و ایمان قرار دیا گیا ہے، مولانا اشرف علی تھانوی صحیح ترمذی کے حوالے سے لکھتے ہیں

’’...کسی شخص کے قلب میں ایمان داخل نہ ہوگا، جب تک تم لوگوں (اہل بیت) سے اللہ اور رسول کے واسطے محبت نہ رکھے ...پس حاصل حدیث کا دو چیزوں کی تاکید ہوئی، احکام شرعیہ پر عمل کرنا اور حضرات اہل بیت سے محبت رکھنا‘‘ (۱)

اس کے باوجود دُشمنانِ آلِ محمدؐ اپنے پیچھے گمراہی اور نفاق کا جو سودا چھوڑ گئے ہیں آج تک اولادِ سیّدہ سلام اللہ علیہا اور خاندانِ نبوت کے چاہنے والوں کو خون کے آنسو رُلا رہا ہے، اِس پر بے اختیار یہ کلمات زبان پر آ جاتے ہیں

سناں کی نوک کبھی شاخِ دار پر محسنؔ
سُخنوروں کو ملے ہیں مشقتوں کے صلے!

۱۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیبؐ۔ از مولانا اشرف علی تھانوی۔ صفحہ ۲۴۷ ناشران تاج کمپنی لمیٹڈ

آغازِ کرب وبلا

دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر غدیر کے خطبہ تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس دین کی ترویج وتبلیغ کرتے رہے اُس دعوتِ حقّہ کا اثر مسلمان ہونے والے تمام افراد پر یکساں نہ تھا، اس بات پر یقین رکھنا کہ اسلام نے تمام اصحابِ رسولؐ کے دلوں کو یکساں مسخر کیا تھا فطرتِ انسانی، عقل، اور خود دین اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان اپنی نوع کے اعتبار سے تو ایک دوسرے کے برابر ہیں مگر عقل، ذہانت، علم، معاشرت، تربیت، اور صلاحیتوں کے اعتبار سے قطعاً ایک جیسا نہیں، یہی اختلاف اسلام کے دو بڑے فرقوں یعنی اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اہل جمہور حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان کو حضرت علیؑ کے ساتھ ہم مرتبہ بتاتے ہیں، اسی غلط فہمی کا شکار مولانا ظفر علی خان بھی ہوئے اور یہ شعر لکھ دیا

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی ابوبکر وعمر عثمان وعلیؑ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کُچھ فرق نہیں ان چاروں میں

اس شعر وعقیدہ کا تجزیہ مولانا سیّد نجم الحسن صاحب کراروی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب چودہ ستارے میں بڑی صراحت سے کیا ہے، (تفصیل کے لئے چودہ ستارے کے بابِ علیؑ کا مطالعہ کریں)، حضرت علی علیہ السلام کی فقط علمی فضیلت ہی تمام اصحابِ نبیؐ پر بھاری تھی، اس ضمن میں حضرت علی علیہ اسلام کی زندگی اور رسولؐ اللہ کی احادیث روشن دلیلیں ہیں، اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں کہتا ہے

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ علم والے اور بے علم کہیں برابر ہوتے ہیں! تحقیق سوچتے وہ ہی ہیں جو صاحبانِ عقل ہیں.

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَات...(۲)

ترجمہ: ان رسُولوں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی اُن میں سے ایسے بھی ہیں جن سے خُدا نے کلام کیا اور بعض کے درجے بڑھائے۔

عام انسان تو درکنار اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول بھی فضیلتوں اور درجات کے اعتبار سے

۱۔ سورۃ الزمر، ۹:۳۹

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۲:۲۵۳

برابر نہ تھے، یہ نا قابلِ انکار دلائل ہیں اور ایسی جسارت کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک تنبیہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے،

...وَيَجعَلُ الرِّجسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعقِلُونَ (۱)

ترجمہ: اور جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان ہی لوگوں پر خُدا اگندگی ڈال دیتا ہے

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک عالمِ دین کی محفل میں بیٹھنے والے اشخاص کبھی بھی ایک جیسی آگہی لے کر نہیں اُٹھتے، جس طرح قوتِ خطاب ہر شخص کے حصّہ میں نہیں آئی اسی طرح قوت فہم بھی سب کے حصّہ میں ایک جیسی نہیں آئی، لہٰذا دیگر افراد کی طرح اصحابِ رسولؐ کو بھی اُن کی قابلیت اور علمی حیثیت کے مطابق تسلیم کیا جانا چاہیے، حضور اکرمؐ کے ان کبار صحابہ کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے وہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے نبیؐ سے پوشیدہ نہ تھے مگر نہ تو اللہ تعالی نے اور نہ ہی اُس کے نبیؐ نے منافقین کے نام لے کر اُن کی براہ راست نشان دہی کی، یہ لوگ مسجدِ ضرار میں جو لوگ اکھٹا ہوتے تھے اور بظاہر مسلمان بھی تھے اور صحابی بھی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس مسجد کو تو گرا دیا مگر وہاں اکٹھا ہونے والوں کی نشاندہی نہ کی، سوال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں نہ کیا؟ صاحبانِ تدبر کے لئے قرآنِ مجید کی یہ آیاتِ مبارکہ بھرپور جواب فراہم کر دیتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

۱۔ سورہ یونس ۱۰:۱۰۰

مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَن تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظاً ○ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُولُ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفَى بِاللّٰهِ وَكِيلاً۔ (۱)

ترجمہ: جس نے رسُول کی اطاعت کی تو اُس نے خُدا کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو (تم کچھ خیال نہ کرو) کیونکہ ہم نے تم کو کچھ پاسبان مقرر کر کے تو بھیجا نہیں ہے. (یہ لوگ تمہارے سامنے تو) کہہ دیتے ہیں کہ (آپ کے) فرمانبردار ہیں لیکن جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ جو کچھ (تم سے) کہہ چکے تھے اس کے خلاف راتوں کو مشورہ کرتے ہیں حالانکہ (یہ نہیں سمجھتے) یہ لوگ راتوں کو جو کچھ بھی مشورہ کرتے ہیں اُسے خدا لکھتا جاتا ہے تم ان لوگوں کی کچھ پرواہ نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو اور خدا کارسازی کے لئے کافی ہے.

یہ آیاتِ مبارکہ تین چار امور کی کُھلی نشاندہی کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں بیٹھ کر فرمانبرداری کا اقرار کرنے والوں میں کچھ منافق بھی تھے اور نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت سے درپردہ روگردانی کرتے تھے بلکہ راتوں کو کسی جگہ باہم مل کر آپؐ کے خلاف صلاح مشورہ اور سازشیں بھی کرتے تھے، حضور صلی

۱۔ سورۃ النسآء ۸۱۔۸۰:۴

اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان افراد کے متعلق خبر تھی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں حکم دیا کہ آپؐ اُن کی پرواہ نہ کریں اور اُس پر بھروسہ رکھیں کیونکہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں اور آپؐ کا کام فقط نیکی کی ہدایت کرنا ہے، یہ ہی وہ حکمِ الٰہی ہے جس کے تحت حضورؐ نے ان افراد کی نشاندہی نہ کی اور مسلسل ہدایت ہی کرتے رہے، مصر کے ایک مشہور صاحبِ قلم محمود ابوریہ اپنی کتاب میں صحیح مسلم سے روایت کردہ ایک حدیث نقل کرتے ہیں:

''میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ میرے پاس وارد ہوں گے جب میں انہیں پہچان لوں گا تو انہیں وہاں سے ہنکا دیا جائے گا میں کہونگا میرے صحابی! ندا آئے گی آپؐ نہیں جانتے آپؐ کے بعد انہوں نے کیا کیا جرم کئے ہیں۔'' (۱)

اللہ کے رُسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیاتِ ظاہری میں تمام اصحاب کے اعمال و افعال سے باخبر تھے اسی لئے اُنھوں نے اچھے اور برے میں تمیز کے لئے مسلمانوں کو ایک معیار فراہم کیا، یہ معیار تھا حضرت علیؑ کی ذات، اُنھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ منافق علیؑ سے محبت نہیں کرے گا اور مومن دشمنی، آپؑ کی محبت ایمان اور آپؑ کا بغض کفر قرار دیا، حتیٰ کہ حضرت علی علیہ السلام کو اپنا نفس قرار دیا، اسی ایک معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تاریخِ اسلام پر نظر ڈالی جائے تو بہت سے چہروں سے نقاب اُلٹ جاتی ہے، حیاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو منافقوں کی سرگرمیاں پسِ پردہ رہیں مگر حضرت علیؑ سے بغض نے اپنی جڑیں پکڑنا شروع کر دی تھیں غزوہ بدر (اسلام کی پہلی دفاعی جنگ) امیر المومنین حضرت علیؑ سے دشمنی کا ایک طرح سے آغاز تھا، اس لڑائی

۱۔ اَضوَا عَلیٰ السُنۃالمُحمَّدیہ ۔ صفحہ ۳۴۴ تالیف محمود ابوریہ۔ ترجمہ نثار احمد زین پوری

میں حضرت علی لشکرِ اسلام کے علمبردار تھے، ابوسفیان لشکرِ کفار کا سربراہ تھا، اس غزوہ میں ۷۰ کفار مارے گئے جن میں سے ۳۶ جنابِ امیرؑ کے ہاتھوں سے واصل جہنم ہوئے، ان لوگوں میں بنی اُمیہ کے بڑے بڑے لوگ بھی شامل تھے، کفار کے گھر ماتم کدہ بن گئے اور مقتولین کے انتقام کی قسمیں کھائی گئیں، ابوسفیان لوگوں کو منع کرتا پھرا کہ رونا بند کرو کیونکہ جب آنسو نکل جائیں گے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے سپہ سالارِ لشکر سے رنج وعداوت میں کمی لائیں گے، اس کے بعد پینتیس (۳۵) دیگر غزوات جن میں احد، خندق، خیبر، اور حنین شامل ہیں جنابِ امیرؑ ہی کفار اور مشرکین کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے لہٰذا ان کے خلاف مقتولین کے رشتہ داروں اور دوستوں میں غم و غصّہ بتدریج بڑھتا رہا، بعض لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اپنی پرانی عصبیت پر قائم رہے، ان میں سے کچھ تو اسلام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکومت و اقتدار کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے، بدلتی ہوئی صورتِ حال میں ان لوگوں کا اسلام میں داخلہ ایک سیاسی ضرورت بن گیا تھا، اسلام نہ ان کی سمجھ میں آیا اور نہ ہی دلوں میں راسخ ہوسکا، دین پر ان کا ایمان یہ تھا کہ غزوہ اُحد میں کفار کی یلغار میں رسولِ خُدا کو تنہا چھوڑ کر پہاڑوں پر بکریوں کی طرح بھاگ نکلے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ صدائیں گونجتی رہیں کہ لوگو! میری طرف آؤ میں اللہ کا رسولؐ یہاں موجود ہوں تم خدا کے رسولؐ کو چھوڑے کہاں بھاگے جاتے ہو، ان بھگوڑوں کو نہ شہادت پر یقین تھا اور نہ ہی رسولؐ اور خُدا پر، اللہ تعالیٰ کو یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ اُس نے قرآن میں اس واقعہ کو بیان کر کے ان لوگوں کا اصل مرتبہ اور حیثیت کھول کر سامنے رکھ دی تاکہ مومنین ان کی فریفتہ کاریوں سے آشنا رہیں، یہ لوگ بھاگ کر مدینہ پہنچے اور باتیں بنانے لگے کہ ہم سے تو رسولؐ نے فتح کا وعدہ کیا تھا یہ شکست کیسے ہوگئی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی،

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱)

ترجمہ: جب تم دور بھاگے چلے جاتے تھے اور کسی کو پلٹ کر (بھی) نہ دیکھتے تھے اور پیچھے سے رسولؐ تم کو پکار رہے تھے پھر خدا نے تم کو رنج پر رنج پہنچایا تا کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اس پر اور جو مصیبتیں تم پر پڑی ہیں ان پر افسوس نہ کرو اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جن میں بار بار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت علیؑ کی بے جا شکایات کیں صرف اس اُمید میں کہ نبیؐ اور اُن کے وصی کے درمیان غلط فہمی پیدا کریں ایسے لوگوں کے ایمان کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی دانست میں نبی کو سازشوں سے بے خبر سمجھتے تھے، محمد رفیق ڈوگر اپنی کتاب الامین میں لکھتے ہیں:

''غدیرِ خُم میں بھی حضرت علیؑ آپؐ کے قافلہ کے ساتھ تھے اللہ کے رسولؐ کو اپنے داماد اور چچازاد بھائی کے بارے میں اس خاص خطبہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

۱۔ سورہ الِ عمران ۳:۱۵۳

علامہ ابن کثیر نے اس بارے میں روایات پر بحث ختم کرتے ہوئے لکھا ہے: چنانچہ جب مال زکات کے اونٹوں پر سواری کرنے سے روکنے اور لباس اتروا لینے کی وجہ سے بکثرت نکتہ چینی اور اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی (اور حضرت علیؑ اس معاملہ میں محض مجبور اور معذور تھے لیکن حاجیوں میں اس نکتہ چینی کی شہرت ہو چکی تھی) تو اس لئے حج کے بعد مدینہ کے راستہ میں غدیرِ خم پہونچ کر اللہ کے رسولؐ نے لوگوں کو خطاب فرمایا اور حضرت علیؑ کے دامن کو پاک فرمایا ان کی قدر ومنزلت کو بلند کیا اور ان کے فضائل سے آگاہ کیا تا کہ لوگوں کے دل و دماغ میں جو اعتراضات سما چکے تھے ان کا ازالہ کریں۔

کپڑے اتروانے کا واقعہ ابن کثیر نے اس طرح بیان کیا ہے، یونس یزید بن طلحہ بن یزید بن رکانہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے ماتحت یمن میں جو لشکر تھا وہ ان سے ناراض ہو گیا جب حضرت علیؑ رسولؐ اللہ کے ساتھ حج کرنے کے لئے خود مکہ روانہ ہوئے تو اُنہوں نے اس لشکر پر اپنا ایک نائب مقرر کر دیا اور جلدی سے آ گئے نائب امیر نے ہر آدمی کو کپڑوں کا ایک ایک جوڑا دیا جب یمن والا لشکر مکہ کے قریب پہنچا تو حضرت علیؑ ان سے ملاقات کے لئے گئے انہیں حلے (جوڑے) پہنے دیکھ کر حضرت علیؑ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا یہ ہمیں نائب امیر نے عطا کئے ہیں۔ حضرت علیؑ نے ان سے پوچھا رسولؐ اللہ کے پاس پہنچنے سے پہلے تم نے یہ انہیں کیوں دیئے؟ رسولؐ اللہ جو چاہتے کرتے چنانچہ حضرت علیؑ نے ان سب کے وہ کپڑے اتروا لئے وہ لوگ اللہ کے رسولؐ کے پاس پہنچے تو انہوں نے

حضرت علی کا شکوہ کیا،

حضرت عمرو بن شاس کا تعلق قبیلہ بنو اسلم سے تھا وہ حدیبیہ میں بھی موجود تھے وہ کہتے ہیں میں اس لشکر میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھا جسے رسولؐ اللہ نے یمن بھیجا تھا حضرت علی نے مجھ سے کچھ بے مروتی اور بد سلوکی کی میرے دل میں ان کے خلاف رنج پیدا ہوگیا جب مدینہ آیا تو میں ہر محفل میں علیؑ کا گلہ کرتا اور ہر ملاقاتی سے علیؑ کا شکوہ کرتا۔ ایک روز رسولؐ اللہ مسجد نبوی میں بیٹھے تھے میں آپؐ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا واللہ اے عمرو بن شاس تو نے مجھے اذیت پہنچائی ہے، میں نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون ۔۔۔۔ میں اللہ کے رسولؐ کو اذیت دینے سے اللہ اور اسلام کی پناہ چاہتا ہوں، رسولؐ اللہ نے فرمایا جس نے علیؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔'' (۱)

رفیق ڈوگرا اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق جتنی پردہ پوشی کر سکتے تھے اس اقتباس سے ظاہر ہورہی ہے، یہ صرف لشکرِ یمن ہی نہیں بلکہ دیگر شخصیات بھی حضرت علیؑ کی ظاہراً و باطناً مخالفت کرتی آئی تھیں، اس مخالفت کو صرف لشکرِ یمن کے سر منڈھ کر وہ دیگر لوگوں کو اس سے بری نہیں کر سکتے، ایک سچ بات البتہ اُن کے قلم سے نکل ہی گئی کہ اعلانِ غدیر حضرت علیؑ کے بارے میں ہی تھا، اس امر کے اقرار کے بعد ذرا اس آیتِ کریمہ پر بھی غور کرلیا ہوتا:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ

۱۔ الامین۔ از محمد رفیق ڈوگر۔ صفحہ ۵٦۷۔۵٦۸ جلد سوم

تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكَافِرِيْن (۱)

ترجمہ: اے رسولؐ جو حُکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا اور (تم ڈرو نہیں) خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا خدا ہرگز کافروں کی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

یہ ہی وہ تاکیدی حکم ہے جس کی وجہ سے رسولؐ اللہ نے غدیر کے مقام پر حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا، کیا یہ آیت اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ لوگ اس حکم کو تسلیم نہ کریں گے اور آمادہ بر خرابی ہوں گے، ڈوگر صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ مخالفتِ علیؑ رسولؐ اللہ کو اذیت پہنچاتی تھی، اس حکم کی اتنی تاکید کہ اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ اے رسول اگر یہ نہ پہنچایا تو تم نے کوئی پیغام نہیں پہنچایا یہ ظاہر نہیں کرتی کہ دین اسلام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد حضرت علی کی ولایت کا اقرار کرنے سے مشتق ہے اور اسی حکم پر مکمل ہوتا ہے اگر یہ حکم نہ پہنچا تو کچھ بھی نہ پہنچا چنانچہ امت کا کوئی بھی فرد منزلِ مقصود تک نہ پہنچ پائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے قبل بھی کئی بار خلافتِ علی کا اعلان کر چکے تھے مگر ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں کے مجمع میں اس کا اعلان ایک اتمامِ حجت تھا کہ کوئی یہ بہانہ نہ بنا سکے کہ اُسے خبر ہی نہ تھی، اس حکم کے پہنچائے جانے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ نے دین کے مکمل ہونے کی نوید سُنائی:

۱۔ سورۃ المآیدۃ ۵:۶۷

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً (۱)

ترجمہ: آج ہم نے تمہارے دین کو کمال کی منزل پر پہنچا دیا تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور دین اسلام کو تمہارے لئے بہترین دین و آئین قرار دیا۔

وفات سے قبل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی مخالفت کے خطرے کے پیشِ نظر سب صحابہ کو لشکرِ اُسامہ میں شامل ہو کر مدینہ سے جانے کا حکم دیا مگر حضرت علی علیہ اسلام کو روک لیا تھا، حکم رسولؐ کی نافرمانی کرتے ہوئے بعض صحابہ لشکر کے ساتھ نہ گئے کیوں کہ اُنہیں خطرہ تھا کہ کہیں اُن کی عدم موجودگی میں حضرت علیؑ خلیفہ نہ بن جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کے ارادے سے باخبر تھے اسی لئے ان کو لشکرِ اسامہ میں شامل کر کے مدینہ سے باہر بھیجنے کی کوشش کی تھی، اُنھوں نے اپنے وصال سے قبل خلافتِ علیؑ کی دوبارہ تاکید اور اس سے متعلق ایک تحریری ہدایت چھوڑنے کا ارادہ بھی کیا مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو نعوذ باللہ بکواس اور ہذیان سے تعبیر کیا گیا، اللہ کے رسولؐ کی تحریر کی موجودگی میں غلط تاؑویلات کی گنجائش نہ رہتی اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا گیا، بعد ازاں یہ مشہور کر دیا گیا کہ رُسولؐ اللہ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں مقرر کیا اور اپنے جانشین کا انتخاب لوگوں پر چھوڑ گئے ہیں، اس تاؑویل نے سیاستِ سقیفہ کو کھل کر پنپنے کی بنیاد رکھی اور عترتِ رسولؐ پر مصائب و آلام کے دروازے کھول دیے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ میں اجلاس منعقد ہوئے تاکہ جلد از جلد

۱۔ سورۃ المآیدۃ: ۵:۳

کسی خلیفہ کا تقرر ہو سکے اپنے میں سے کسی کو خلیفہ بنا لیا جائے وگرنہ حضرت علیؑ کے آ جانے سے کسی کو حکمرانی نہ ملے گی، سقیفہ درحقیقت تاریخ اسلام کی پہلی منظّم سازش تھی جس نے اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بعد میں آنے والے المیّوں کو جنم دیا۔

''محققین تاریخ کو اس کا اندازہ ہو گا کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی علت وفات رسولؐ کے بعد سقیفہ بنانے والوں کی سیاسی سرگرمیاں تھیں، انہوں نے خدا اور رسولؐ سے واضح نصوص کے مقابل اجتہاد کیا اور ذاتی رائے پر مسلمانوں سے زبردستی عمل کرایا۔'' (۱)

مولانا مودودی نے حضرت ابوبکر کے خلیفہ منتخب کئے جانے کے بارے میں حضرت عمر کا ایک قول نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''اگر میں ایسا نہ کرتا (یعنی ابوبکر کو خلیفہ نامزد نہ کرتا) اور خلافت کا تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس (سقیفہ بنی ساعدہ) سے اُٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہوا اور بدلنا بھی مشکل'' (۲)

سبحان اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو ہذیان کہا، پھر جمہور کی رائے کو غلط

۱۔ کل الحلول عند آل الرسول۔ صفحہ ۹۳۔ از ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی، ترجمہ سید امتیاز حیدر

۲۔ خلافت وملوکیت ۔ صفحہ ۸۴۔ از مولانا سید اعلیٰ مودودی

کہہ کر اپنی رائے کو سب پر مقدم کیا، جب وفات پانے لگے تو اپنی رائے کو بھی ایک طرف کر دیا اور فیصلہ اپنے نامزد افراد کے ایک گروہ کے حوالے کر دیا، یہ تھا اثر اُس اندیشے کا کہ کہیں رسولؐ اللہ کے کہنے کے مطابق حضرت علیؑ کو خلیفہ نہ بنا لیا جائے کیونکہ اسے ماننا اُن کے لئے مشکل تھا اور اسی کے لئے ہی تو اتنے پاپڑ بیلے گئے تھے لہٰذا بدلتی ہوئی ضرورت کے مطابق سقیفائی سیاست اپنے ہی اصول بار بار تبدیل کرتی رہی، مولانا نجم الحسن کراروی نے تاریخ بغداد اور شرح ابن ابی الحدید جلد ا کے حوالے سے حضرت عمر کا بیان نقل کیا ہے:

''جب آنحضرت صلعم نے اپنے مرض الموت میں حق کو چھوڑ کر باطل کی طرف جانا چاہا تاکہ علیؑ کے نام کی صراحت کر دیں تو خدا کی قسم میں نے آنحضرت کو منع کر دیا اور آنحضرت علیؑ کے نام کو تحریراً ظاہر نہ کر سکے،'' (۱)

اس کے باوجود جب حضرت عمر خود خلیفہ بنے تو اُنہیں اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ

''خدا کی قسم، میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ،'' (۲)

چنانچہ لوگوں نے نہ صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو پائمال کر دیا بلکہ ہر وہ جتن کیا کہ جس سے حضرت علیؑ کی عظمت و فضیلت کو لوگوں کی نظروں میں

۱۔ چودہ ستارے۔ صفحہ ۱۳۰

۲۔ خلافت وملوکیت۔ صفحہ ۸۸

گھٹایا جا سکے، جن لوگوں نے سقیفائی خلافت کو تسلیم نہ کیا اُن کے خلاف طاقت کا استعمال کیا گیا، حضرت عمر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بنتِ رسولؐ اللہ کے گھر پر آگ لے کر گئے اور دھمکی دی کہ اگر حضرت علیؑ اور اُن کے اصحاب باہر نہ آئے تو گھر کو جلا دیا جائے گا، ان اصحاب میں بنی ہاشم کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت عتبہؓ بن ابی لہب، حضرت خالد بن سعیدؓ، حضرت مقداد بن عمرؓ وغیرہ شامل تھے جو حضرت علیؑ کے مقابلے میں حضرت ابوبکر کی خلافت کو تسلیم نہ کرتے تھے اور سیّدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر میں جا کر بیٹھ گئے تھے، جب دھمکیوں سے بات نہ بنی تو خانہ بنتِ رسولؐ کو آگ لگا دی گئی، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا دوڑ کر دروازے پر آئیں اور لوگوں کو اس عمل سے منع کرنا چاہا تو حضرت عمر نے دروازے پر لات مار کر اُسے بی بی کے اوپر گرا دیا، آپ کی کمر پر زخم لگا اور آپ کی تین پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں، آپ کے بیٹے جنابِ محسنؑ بن علیؑ بھی اس ضرب سے شہید ہو گئے اور یہ ہی زخم بعد ازاں جنابِ معصومہؑ کی شہادت کا باعث بنا، ان لوگوں نے خانہ بتولؑ میں داخل ہو کر خوب دھما کہ چوکڑی مچائی اور حضرت علیؑ کی گردن میں رسی ڈال کر دربار میں لے گئے، مطالبہ بیعت کیا گیا مگر اُنھوں نے نہ بیعت کرنی تھی نہ کی، سقیفہ کے سیاست دانوں نے بعد ازاں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اس ضمن میں ایک فرضی حدیث بھی گھڑ لی، باغِ فدک جنابِ زہراؑ کی وہ جائداد تھی جس کی آمدنی مساکین و فقراء میں تقسیم کی جاتی تھی، چنانچہ یہ سمجھا گیا کہ کہیں اس آمدنی سے حضرت علی علیہ اسلام اپنے حمایتی نہ اکھٹے کر لیں، ہر روز بڑھتے ہوئے صدمات کی وجہ سے حضرت فاطمہؑ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے سخت ناراض ہوئیں اور اُنھیں نہ صرف مرتے دم تک معاف نہ کیا بلکہ یہ وصیت کر کے گئیں کہ ان حضرات کو اُن کے جنازہ میں بھی شریک نہ کیا جائے، تاریخ میں یہ بات مرقوم ہے کہ جنابِ فاطمہؑ نے ان حضرات کے سلام کا جواب

بھی نہیں دیا۔

کچھ لوگ اپنے نفسوں کو آئمہ طاہرین کے نفسوں پر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ یہ حضرت علیؑ کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اس طرح خاموش رہیں کسی کا مقابلہ نہ کریں جبکہ مخالفین اُن کی اہلیہ محترمہ کو زخمی کریں، بچے کو شہید کریں، اُن کے گھر کو نذرِ آتش کریں اور پھر اُن کے گلے میں رسی ڈال کر دربار میں لے جائیں، ایک عام آدمی کے لئے حقیقتاً یہ بہت مشکل بات ہے مگر حضرت علیؑ نے جو کہ نفسِ رسولؐ ہیں وہی کرنا ہے جس کی ہدایت اللہ کے رسولؐ نے کی تھی، رسول کریمؐ نے فرمایا تھا کہ اے علیؑ میرے بعد تم کو سخت صدمات پہنچیں گے، تمہیں چاہئے کہ اس وقت دل تنگ نہ ہوا اور صبر کا طریقہ اختیار کر وا اور جب دیکھنا کہ میرے صحابہ نے دُنیا اختیار کر لی ہے تو تم آخرت اختیار کئے رہنا۔ چنانچہ تاریخ اعظم کوفی نے جناب امیرؑ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے اس وقت کا بہت زیادہ خیال رکھا کہ رسولؐ خدا نے مجھ سے عہد خاموشی وصبر لے لیا تھا۔'' مولانا کراروی نے یہ قول نقل کیا:

'' خدائے جلیل کی قسم اگر محمد رسولؐ اللہ ہم سے عہد نہ لے لیتے اور ہم کو اس امر سے مطلع نہ کر چکے ہوتے جو ہونے والا تھا تو میں اپنا حق کبھی نہ چھوڑتا، اور کس شخص کو اپنا حق نہ لینے دیتا۔'' (۱)

یہ صبر کتنا کٹھن تھا اس کا اندازہ لگانا ایک عام انسان کے بس کا روگ نہیں، خود مولائے کائنات نے اس اسرار کی فقط ایک جملے سے وضاحت کر دی، فزت برب الکعبه (ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)، میں اکثر سوچتا تھا کہ مولا زخمِ رخصت کھانے کے بعد اتنے یقین کے ساتھ آپ کس کامیابی کا عندیہ دے رہے ہیں؟ قرآنِ مجید کی آیت

۱۔ چودہ ستارے۔ صفحہ ۱۵۰

و مِنَ النّــاسِ مَن یشری کی روشنی میں آپ کب کامیاب نہ تھے؟ یہ اسرار اُس وقت منکشف ہوتا ہے جب آپؑ کے اس جملے کو رسولؐ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کے ساتھ منطبق کر کے دیکھا جائے، اُس وقت شیرِ خُدا کی صدمات ومشکلات پر خاموشی اور ذوالفقار کا نیام میں ہی ٹکا رہنا سمجھ میں آتا ہے۔

خلافت کے ابتدائی دور سے جو ۲۵ سال پر محیط ہے اہل بیت نبیؐ کے لئے مصائب وابتلاء کا آغاز ہوا جو آج تک اُن کی اولاد اور پیروکاروں کے لئے جاری ہے، جب مولائے کائنات خلافتِ ظاہری پر جلوہ افروز ہوئے تو حالات اس قدر دگرگوں ہو چکے تھے کہ وہ اطمینان کا سانس بھی نہیں لے سکتے تھے، دشمنانِ اہل بیت پہلے سے زیادہ منظّم اور مضبوط ہو کر کھلی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے، فرضی احادیث کا ایک انبار لگا دیا گیا تھا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جا رہا تھا چنانچہ حضرت مالک بن نویرہؓ امیر المومنین کی محبت میں شہید ہونے والے پہلے فرد بنے اور اسی جرم میں حضرت ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کر دیا گیا، حضرت سلمان فارسیؓ اتنے بد دل ہوئے کہ مدینہ چھوڑ کر مدائن چلے گئے، اور جو اصحابِ باوفا باقی بچے وہ جنگِ صفین میں جامِ شہادت نوش کر گئے ان میں حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت اویس قرنیؓ بھی شامل تھے،

> ''جھوٹی روایات کی تخلیق اس تیزی سے ہو رہی تھی کہ سچی روایات پر پردے پڑتے جا رہے تھے، عرب کے ہادیِ مرسل کی سیرت میں سیرتِ شیخین پہلے ہی مدغم ہو چکی تھی، تیسرے شیخ کی طویل المدت سیرت اس میں ضم ہوئی تو وہ اسلام اور جاہلیت کے عرب ذہین کا آمیزہ بن گئی اور اس کا نام سنتِ رسول رکھا گیا،'' (۱)

۱۔ تاریخ شیعانِ علیؑ۔ صفحہ ۳۷

تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ حضرت عثمان نے مروان بن حکم کو وزیر بنایا، یہ وہ شخص تھا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی شرارت و خباثت کی وجہ سے مدینہ سے نکلوا دیا تھا لوگ اس کو طرید رسولؐ کہا کرتے تھے، دریں اثناء مخالفینِ علیؑ کے ہاتھ ابو ہریرہ جیسا شخص آیا گیا جس کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ وہ فضول و بیہودہ باتیں کرتا تھا، یہ ہی شخص اسلام میں حدیثِ رسول کا سب سے بڑا راوی بنا ستم تو یہ ہے کہ ابو ہریرہ صرف ایک سال اور نو ماہ رسولؐ اللہ کے ساتھ رہا اور ۵۳۷۴ احادیث کو روایت کرتا ہے، حضرت علی علیہ اسلام نے اس شخص کے چہرے سے یہ کہہ کر نقاب اُتار دیا تھا کہ زندہ لوگوں میں رسولؐ پر سب سے زیادہ جھوٹ باندھنے والا ابو ہریرہ ہے، محمود ابوریہ کہتے ہیں:

''وہ (ابو ہریرہ) پیٹ بھرنے کی غرض سے رسولؐ کے صحابی بنے تھے جیسا کہ خود ابو ہریرہ نے بارہا اس کا اعتراف کیا ہے، ناداری کی وجہ سے صفہ کو اپنی پناہ گاہ بنالیا تھا وہاں دیگر افراد کی طرح کھاتے یا رسولؐ یا کسی صحابی کے گھر کھانا کھاتے تھے...اور جب حضرت علیؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ چھڑی یا یہ کہئے کہ جب ہاشمیوں اور اُمویوں میں معرکہ آرائی ہوئی ...ابو ہریرہ اس طرف گئے جدھر ان کی طبیعت کا میلان تھا جو ان کے ہوائے نفسانی کے موافق تھا یعنی معاویہ کے پاس چلے گئے کہ وہاں بادشاہت کے اسباب و وسائل عیش و نشاط اور مال و دولت تھے، حضرت علیؑ کی طرف زہد فقر اور بھوک تھی اور جس شخص نے ابو ہریرہ کی سی زندگی گزاری ہو اس سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ اس

راستہ سے ہٹ جائے جو علیؑ کی طرف لے جاتا ہے اور معاویہ کی طرف جانے والا راستہ اختیار کرے تاکہ رنگین اور گوناگوں قسم کے کھانوں سے اپنا پیٹ بھرے اور اس (معاویہ) کی بخشش وعطا اور امداد سے اپنا مقصد پورا کرے... بنی اُمیہ ابو ہریرہ کے احسانات کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی محبت وخلوص کی قدر کرتے تھے اُنھیں اپنی بخشش وعطا اور امداد والطاف میں غرق کر دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اُنکی مفلسی مالداری میں بدل گئی، تنگ زندگی خوشحالی میں فقر ثروت میں بدل گیا جبکہ اس سے قبل وہ ایک کمبل سے اپنا جسم چھپاتے تھے اور اب بہترین لباس پہننے لگے،'' (۱)

یہ سب کچھ بنواُمیہ نے ابو ہریرہ کو کیوں دیا اور ابو ہریرہ نے بنواُمیہ کو کیا دیا، تاریخ کے بے ضمیر مورخ اپنی بساط بھر اسے چھپاتے پھرے مگر حق کہیں نہ کہیں سے ظاہر ہو کر ہی رہتا ہے چنانچہ محمود ابوریہ ہی لکھتے ہیں کہ

''ابو ہریرہ نے تلوار سے جہاد کے ذریعہ اور اپنے مال سے معاویہ کی مدد نہیں کی تھی ان کا جہاد تو صرف یہ تھا کہ وہ لوگوں کے درمیان ایسی حدیثیں پھیلائیں جن سے علیؑ او ان کے انصار کی ہتک ہوتی ہو اور لوگوں کو ان (علیؑ) سے بدظن کریں اور معاویہ اور اس کی حکومت کو محکم کریں'' (۲)

۱۔ اَضوَا عَلیٰ السُنةالمُحَمَّدیه ۔ صفحہ ۲۶۵۔۲۶۴

۲۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۶۵۔۲۶۴

اس طرح ابو ہریرہ معاویہ کی حمایتی اُس ٹیم کے لیڈر تھے جس میں عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ، اور تابعین میں عروہ بن زبیر شامل تھے ان سب کو معاویہ نے حضرت علیؑ کے خلاف حدیث گھڑنے پر مامور کیا کہ جن سے آپ پر طعن و تشنیع کی جا سکے، یہ نیا کام نہیں تھا بلکہ اس کا آغاز تو سقیفہ سازی کے وقت ہی ہو گیا تھا معاویہ اور بعد کے لوگ تو تقلیدِ سقیفہ میں تھے، وہ لوگ جن کی زندگیوں کے چالیس چالیس سال بُت پرستی میں گزرے تھے اُنکا حقِ خلافت جتلانے کے لئے ضروری تھا کہ عوام الناس میں ان کو حضرت علیؑ سے افضل ثابت کیا جائے چنانچہ اس مہم کا آغاز ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین اور چچا حضرت ابو طالب علیہ اسلام کو غیر مسلم ثابت کرنے سے ہوا، آج بھی لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسولؐ اللہ کے والدین (نعوذ باللہ) مشرک تھے، اس مہم کا زیادہ زور حضرت ابو طالب علیہ سلام کے خلاف رہا اور یہ روایت گھڑ لی گئی کہ آنحضرتؐ نے جنابِ ابو طالبؑ کے آخری وقت اُن کے کان میں کہا کہ آپ اسلام قبول کرلیں مگر اُنھوں نے کلمہ نہ پڑھا، حیرت کی بات ہے کہ سننے والے کی سماعت اتنی تیز تھی کہ اُس نے کان میں کی جانے والی سرگوشی بھی سن لی، اس سے سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی کیا جاتا ہے جن کی عمر وفاتِ حضرت ابو طالبؑ کے وقت صرف تین برس تھی، مولانا شبلی نعمانی کا کہنا ہے حضرت ابو طالبؑ مرتے وقت بھی کلمہ پڑھ رہے تھے لیکن بخاری کی ایک مجہول روایت کی وجہ سے اُنھیں غیر مسلم سمجھا جاتا ہے، بہرحال ایمانِ حضرت ابو طالبؑ پر علماءِ حقہ نے مفصل بحثیں کی ہیں یہاں تو یہ بتانا مقصود تھا کہ اجدادِ رسولؐ اور حضرت علیؑ کے خلاف مہم کا آغاز کہاں سے اور کیسے شروع ہوتا ہے،

وفاتِ رسولؐ اللہ تاریخِ اسلام میں غزوہ بدر اور فتح مکہ کے بعد تیسرا بڑا اور انمٹ نقوش

چھوڑنے والا واقعہ تھا جس نے حقیقی مسلمانوں اور سیاسی اغراض و مجبوری سے اسلام قبول کرنے والوں میں واضح تفریق کی، غزوہ بدر میں جو لوگ اللہ تعالیٰ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور شہادت پر حقیقتاً ایمان رکھتے تھے وہ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے باقی لوگ سر پر پاؤں رکھ کر تپلی گلی سے بھاگ نکلے، فتح مکہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے خانہ کعبہ اور دشمنِ اسلام ابو سفیان کے گھر کو جائے پناہ قرار دیا اور کہا کہ جو اس میں داخل ہو گیا اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ بظاہر یہ حیران کن بات ہے کہ جس شخص نے اسلام کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی، سینکڑوں اصحابِ رسولؐ کا خون جس کی گردن پر ہو، اور جس نے موت کے خوف سے مغلوب ہو کر مجبوراً اسلام قبول کیا ہو اُس کے گھر کو جائے پناہ قرار دے دیا جائے، اہلِ جمہور تو اس کو ابوسفیان کی ایک بڑی فضیلت قرار دیتے نہیں تھکتے لیکن دراصل یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بڑا سیاسی قدم تھا اور وہ مسلمانوں پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ جو خانہ کعبہ کو چھوڑ کر حرمِ ابوسفیان میں داخل ہوگا وہ دوغلی نیت والا ہو گا، خانہ کعبہ میں تو وہ ہی داخل ہوگا جو سچا مسلمان ہوگا اور ابوسفیان کے گھر میں وہ جائے گا جو اُسے یقین دلائے گا کہ وہ بھی مجبوراً اسلام قبول کر رہا ہے، اسی طرح بنتِ رسولؐ اللہ کے گھر کے مقابلے پر سقیفہ بنی ساعدہ نے بھی ابوسفیان کے گھر کا کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کر دیا، یہ ہی دو گروہ آج تک چلے آ رہے ہیں اور جتنے بھی فرقے ہیں بنیادی طور پر انھی دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

آلِ رسول کی غربت

پہلا دور

مسلمانوں میں اوّلین اختلاف سقیفہ کی بنیاد بنا، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک سازش تھی جس کے ذریعہ رسولؐ اللہ کے احکامات سے روگردانی کی گئی، اس اختلاف کے کی وجہ سے ایک باقاعدہ جماعت وجود میں آ گئی جس نے بعدازاں ایک مکتبہ فکر بن کر مسلمانوں کی اکثریت کو پیروکار بنا لیا، ان کے برعکس محبانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ فرمودات و احکاماتِ رسولؐ کے پابند رہے اور مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے یہ لوگ منصبِ خلافت کو احکاماتِ رسولؐ کے تحت منصوص من اللہ سمجھتے تھے اور اس کا اصل حقدار حضرت علی علیہ السلام کو مانتے تھے، سقیفائی اسلام مختلف ہتھکنڈوں سے لوگوں کو ساتھ ملاتا رہا اور مخالفین کو شیعانِ علیؑ کے نام سے پکارنے لگا، سقیفائی گروہ خلافت کو جمہوری عہدہ قرار دے کر حضراتِ شیخین کو اس کا اہل قرار دیتا رہا، عہدوں اور مال و دولت کی لالچ، حضرت علی سے بغض و عناد، دینِ الٰہی کی خودساختہ تشریحات، اور دربار سے وابستہ راویانِ حدیث اور مُلاؤں نے وہ ماحول پیدا کرنے میں اہل سقیفہ کی بھرپور مدد کی جس نے شیعان علیؑ کی مشکلات میں دن رات اضافہ کیا، یوروپین تاریخ دان ایڈورڈز گبن (Edwards Gibbon) اپنی مشہورِ زمانہ کتاب سلطنتِ روما کا انحطاط اور زوال (The Decline

And Fall Of The Roman Empire) کے پچاسویں باب میں لکھتا ہے:

> The persecutors of Mahomet usurped the inheritance of his children; and the champions of idolatry became the supreme heads of his religion and empire. The opposition of Abu Sophian had been fierce and obstinate; his conversion was tardy and reluctant; his new faith was fortified by necessity and interes
> (۱)

ترجمہ: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسلسل اذیتیں پہنچانے والے لوگوں نے اُن کے بچوں کا ورثہ غصب کیا اور بُت پرستی کے چیمپین آپؐ کے مذہب و مُلک کے حاکمِ مُطلَق بن بیٹھے. ابوسفیان کی مخالفت ہٹ کی پکی اور ظلم پر مبنی تھی، وہ بہت دیر سے خلافِ مرضی مسلمان ہوا تھا اور اُس کا نیا مذہب مفاد پرستی اور ضرورت سے لبریز تھا.

اس صورتِ حال میں شیعانِ علیؑ اپنے امام اور وصی رسولؐ اللہ کے حکم کے مطابق خاموش رہے اور عملاً گوشہ نشین ہو کر فقط دین کی تبلیغ میں منہمک رہے، وہ خلافت وحکومت کے امور سے اگرچہ کنارہ کش رہے مگر حضرت علی علیہ السلام کے حق کو ماننے سے کبھی دست بردار نہ ہوئے، اسی عالم میں تقریباً ایک چوتھائی صدی کا عرصہ گزر گیا اور خلافت اُس کے اصل حقدار کے پاس لوٹ آئی لیکن اس عرصہ میں اہل بیت کے متعلق گمراہی اور دشمنوں کے دلوں میں بغض وعناد مزید گہرا ہو چکا تھا لوگ حضراتِ شیخین کی سیاسی مصلحتوں کے تحت کی جانے والی تبدیلیوں کے عادی ہو چکے تھے، جب قتلِ عثمان کے بعد

۱۔ http://www.ccel.org/g/gibbon/decline/volume2/chap50.htm#Moawiyah

حضرت علیؑ کو خلیفہ ماننے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ملا تو اُن سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی گئی کہ وہ حضراتِ شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے مگر آپؑ نے صاف انکار کر دیا، ظاہری خلافت کی عنان سمبھالتے ہی حضرت علی علیہ السلام نے حکومت کی تنظیم و ترتیب دین کے حقیقی اصولوں پر شروع کی تو مخالفین شورشیں برپا کرنے لگے۔

حضرت عائشہ حضرت علیؑ کی سب سے بڑی دشمن بن کر ظاہر ہوئیں اور طلحہ و زبیر کے ساتھ مل کر علمِ بغاوت بلند کر دیا، دوسری طرف معاویہ ابنِ ابی سفیان سارے حالات کو بغور دیکھ کر حکمتِ عملی وضع کرتے رہے، تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ معاویہ نے بیت المال کا بے دریغ استعمال کر کے لوگوں کی ہمدردیاں خریدیں، ان کے سایہ میں اکٹھے ہونے والوں میں اکثریت مال و دولت اور عہدوں کے لالچی تھے، معاویہ کے باقی ساتھیوں میں وہ لوگ تھے جن کے باپ، دادا، یا رشتہ داروں اور عزیزوں کو حضرت علیؑ نے مختلف غزوات میں واصلِ جہنم کیا تھا لہٰذا بدلے کا اشتیاق اُنھیں دمشق کے جھنڈے تلے لے گیا، حضرت علیؑ نے حضراتِ شیخین کے دور میں مقرر ہونے والے جن گورنروں کو معزول کیا تھا وہ بھی اپنے اپنے حمایتیوں کے ساتھ معاویہ اور حضرت عائشہ کے پاس جمع ہوتے گئے، اس گٹھ جوڑ نے اسلام میں دوسری منظّم سازش اور خلیفہ وقت کے خلاف پہلی بغاوت کو جنم دیا جو انتقامِ حضرت عثمان کا نعرہ لے کر اُٹھی اور جنگِ جمل کا محرک بنی، حضرت عائشہ کے تیس ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے پیش قدمی کرتے ہوئے بصرہ پر شب خون مارا اور حضرت علیؑ کی طرف سے مقرر وہاں کے گورنر حضرت عثمان بن حنیفؓ کے چالیس ساتھیوں کو مسجد میں شہید کر دیا گیا حضرت عثمانؓ کو گرفتار کر کے اُن کا سر، بھویں، داڑھی، اور پلکوں کے بال نوچ ڈالے گئے، بعدازاں مزید ۱۴۰ افراد کو شہید کیا گیا، الغرض حضرت علی نے بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ باغیوں کا مقابلہ کیا اور اُنھیں شکستِ فاش دی، اسی طرح حضرت معاویہ جنگِ صفّین میں مقابل آئے اور

شکست سے بچنے کے لئے قرآن سروں پر اُٹھا کر مکر وفریب کا سوانگ رچایا گیا، لوگوں کی ایک اور جماعت (خوارج) اس جنگ کے نتیجہ میں سامنے آئی اور اُس نے امیرالمومنینؑ سے جنگِ نہروان برپا کی، ان شورش زدہ حالات میں حضرت معاویہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لئے حضرت علیؑ ساٹھ ہزار کے لشکر کے ساتھ فیصلہ کن یلغار کرنے کی تیاری کر رہے تھے، حضرت معاویہ کو ان تیاریوں کی خبر تھی چنانچہ اُنھوں نے سازش سے ایک خارجی عبدالرحمٰن ابنِ ملجم کی امداد کی جس نے موقع ملتے ہی جنابِ امیر علیہ اسلام کو شہید کر دیا، آپؑ کیا شہید ہوئے اہل بیت رسولؐ پر مشکلات و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور اُس غربت و ہجرت کا آغاز ہوا جو ہنوز جاری ہے۔

شہادتِ امیرالمومنینؑ کے بعد حضرت امام حسنؑ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی لیکن حضرت معاویہ کی سازشیں اور اُن کے پروردہ افراد جگہ جگہ نفاق کا بیج بوتے رہے، اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے عمر بن حریث، اشعث بن قیس، حجر ابن الحجر، شیث ابن ربعی کو قتلِ امام حسنؑ پر مامور کیا اس مشن میں کامیاب ہونے والے کو دو لاکھ درہم نقد انعام اور اپنی کسی بیٹی سے اُس کی شادی کرانے کا وعدہ بھی کیا، حالات اتنے خراب ہو گئے کہ امام حسنؑ جب نماز پڑھنے کے لئے بھی گھر سے نکلتے تو زرہ پہن کر باہر آتے، اسی اثنا میں حضرت معاویہ نے لشکر کشی کی جس کے مقابلہ میں امام حسنؑ نکلے، حضرت معاویہ نے افواہ سازی کے ذریعے لشکرِ امامؑ میں بغاوت اور بدگمانی پیدا کر دی، امام کے اپنے ہی لشکریوں نے اُن پر حملہ کر دیا اور وہ زخمی حالت میں مدائن چلے گئے ان حالات میں اُن کے پاس صلح کے سوا دوسرا راستہ نہ تھا مگر اس کے لئے جن شرائط کا انتخاب کیا گیا تھا حضرت معاویہ اُن پر راضی ہو گئے تھے مگر بعد میں ان سے عملاً مکر گئے، اقتدار پر مکمل قبضہ کے فوراً بعد اُنھوں نے تمام حاکموں اور عمال کو ہدایت کی کہ کسی شخص کو حضرت علیؑ اور اہلِ بیتؑ کی فضیلت کے متعلق کوئی روایت بیان نہ کرنے دی جائے، دوسری طرف

مساجد کے ممبروں سے جنابِ امیرؑ کو سرکاری حکم کے تحت برا بھلا کہا جانے لگا، ابن ابی سفیان نے اسی پر اکتفا نہ کیا اور ایسے افراد کو حکومتی عہدے دیئے جو مال و دولت اور دُنیاوی شان وشوکت کی لالچ میں اہل بیتؑ اور اُن کے محبان کے خلاف انتہائی اقدام سے بھی گریز نہ کریں، زیاد ابن ابیہ ایسا ہی ایک شخص تھا جسے کوفہ میں شیعانِ علیؑ کی نسل کُشی کے لئے منتخب کیا گیا، مولانا کراروی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''زیاد ابن ابیہ جو کئی برس تک حضرت علی علیہ السلام کے عہد میں ان کے عمال میں رہ چکا تھا وہ شیعان علیؑ کو اچھی طرح سے جانتا تھا، مردوں، عورتوں، جوانوں، اور بوڑھوں سے اچھی طرح آگاہ تھا اسے ہر ایک رہائش اور کونوں اور گوشوں میں بسنے والوں کا پتہ تھا، اسے کوفہ اور بصرہ دونوں کا گورنر بنا دیا گیا تھا، اس کے ظلم کی حالت یہ تھی کہ شیعیان علی کو قتل کرتا اور بعضوں کی آنکھوں کو پھوڑ دیتا اور بعضوں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا تھا، اِس ظلم عظیم سے سینکڑوں تباہ ہو گئے، ہزاروں جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے، بصرہ میں آٹھ ہزار آدمیوں کا قتل واقع ہوا جن میں بیالیس حافظ اور قاری قرآن تھے، ان پر محبت علیؑ کا جرم عائد کیا گیا تھا۔ حکم یہ تھا کہ علیؑ کے بجائے عثمان کے فضائل بیان کئے جائیں اور علیؑ کے فضائل کے متعلق یہ فرمان تھا کہ ایک ایک فضیلت کے عوض دس دس منقصت و مزمت تصنیف کی جائیں یہ سب کچھ امیر المومنینؑ سے بدلہ لینے اور یزید کے لئے زمین خلافت ہموار کرنے کی خاطر تھا'' (۱)

۱۔ چودہ ستارے۔

صلح نامہ کے بعد حضرت معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو متعدد بار زہر کے ذریعہ قتل کرانے کی کوشش کی، امام مدینہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دشمنِ ازلی کو اپنے بیٹے کی بادشاہی کے لئے راستے کے تمام کانٹے ہٹانا تھے، چنانچہ حضرت معاویہ نے مدینہ کے گورنر مروان بن حکم کو ہر قیمت پر حضرت امامؑ کو قتل کرنے کی ہدایت کی، مروان نے ایک عیسائی عورت الیسونیہ کے ذریعہ جعدہ بنت اشعث جو کہ حضرت امام کی زوجیت میں تھی کے پاس زہر پہنچایا اور اُس سے کہا کہ معاویہ تجھے بے حساب نقد انعام واکرام سے نوازے گا اور اُس کا عقد یزید سے کر دیا جائے گا، جعدہ نے کئی بار حضرت امامؑ کو زہر دیا مگر وہ بچ جاتے، ایک دن اس نے پانی میں زہر ملا کر دیا جس سے امام کی شہادت واقع ہوئی، مروان نے بعد ازاں جعدہ کو حضرت معاویہ کے پاس روانہ کیا مگر اُنھوں نے انعام واکرام اور یزید کے ساتھ نکاح کے بجائے جعدہ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریائے نیل میں پھنکوا دیا۔

امامؑ نے وصیت کی تھی کہ اُنھیں اپنے نانا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے، جب اہل بیت جنازہ لے کر وہاں پہنچے تو حضرت عائشہ ایک خچر پر بیٹھ کر وہاں پہنچ گئیں اور کہا کہ یہ اُن کا گھر ہے جس میں امام حسنؑ کو دفن نہ ہونے دیں گی بات بڑھ گئی اور حضرت عائشہ کے ساتھیوں نے بنی ہاشم پر تیر برسانے شروع کر دیئے کئی تیر حضرت امام حسنؑ کے تابوت پر بھی داغے گئے، اہل بیت رسولؐ اور اُن کے محبان اس ہنگامے میں جنازۂ امام لے کر واپس پلٹ آئے اور مجبوراً امام حسنؑ کو جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا۔

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کے منصوبہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حضرت امام حسینؑ تھے چنانچہ اُن کے گرد سازشوں کا گھیرا تنگ کیا جانے لگا، بیعتِ یزید کی خاطر معاویہ ۵۶ھ میں ایک لشکر لے کر مدینہ پہنچے اور حضرت امام حسینؑ سے اقرار

لینے کی کوشش کی مگر امام نے انکار کر دیا، معاویہ دیگر لوگوں سے بیعت یزید لیتے رہے اور اسی دوران ۶۰ھ میں انتقال کر گئے، یزید نے اقتدار سمبھالتے ہی حضرت امام حسینؑ اور بعض دیگر کبار شخصیات سے زبردستی بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے عمالوں کو لکھا کہ اگر وہ انکار کریں تو اُن کے سر کاٹ کر اُس کے پاس دمشق روانہ کر دیے جائیں، حالات اُس نہج پر پہنچ گئے کہ آپؑ کو دورانِ حج مکہ مکرمہ میں شہید کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جسے آپؑ نے حکمتِ عملی سے ناکام بناتے ہوئے حرمِ مقدس کے تقدس کو پامالی سے بچایا، بعد ازاں اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وقت کا مشکل ترین دور آیا اور کربلا کے ریگ زار میں اُنھیں چن چن کر بھوک اور پیاس کی حالت میں شہید کر دیا گیا، نبی زادیوں کو برہنہ سر بازاروں میں پھرایا گیا اور ظلم وستم کا ہر وہ نشتر استعمال کیا گیا جس کی چبھن اور کاٹ آج بھی اہل بیت اطہار سے محبت رکھنے والوں اور سادات کو خون کے آنسو رُلاتی ہے، جنت کے دونوں سرداروں کے صرف دو فرزند حضرت امام علی بن حسین (زین العابدین) علیہ السلام اور حضرت حسن مثنیٰ دشمنانِ اہل بیتؑ کے ہاتھوں سے محفوظ رہے، حضرت حسن مثنیٰ کے بارے میں روایات ہیں کہ وہ زخمی حالت میں شہدائے کربلا کے لاشوں تلے دب گئے تھے، قبیلہ بنی اسد کے لوگوں نے اُنھیں بعد میں زندہ پا کر نکالا۔

ستم تو یہ رہا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت خوف، لالچ، کم علمی، اور دشمنی آلِ رسولؐ وعلیؑ میں حکمرانوں کی حمایتی رہی، لوگ آج بھی سوال کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کیا عجیب سا اجرِ رسالت مانگا تھا کہ میرے اہل بیت سے مودت رکھنا، عقل کے ان اندھوں کی نظریں مصائبِ اہل بیت تک نہیں پہنچ سکتیں کیونکہ اُن پر بغضِ اولادِ رسولؐ کے پردے پڑے ہوئے ہیں، اُنھیں اس بات پر بھی یقین نہیں ہے کہ آنحضرتؐ اپنے بعد رونما ہونے والے تمام واقعات سے باخبر تھے، وہ جانتے تھے کہ

اُمت اُن کی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہی ہے، کربلا کے بعد خوف زدہ بچوں اور مستوراتِ عصمت کی اُس بے بسی اور کیفیت کا اندازہ لگانا ہی جگر پاش پاش کر دیتا ہے، ہائے وہ بے بسی کہ جب نظریں اپنے پیاروں کے نیزوں پر بلند خون آلودہ سروں پر پڑتی ہونگیں، یہ منظر ایک دو دن نہیں بلکہ اُن پتھرائی ہوئی آنکھوں نے کربلا سے دمشق تک تازیانے کھاتے، بے کجاوہ اُنٹوں کی پشت پر سفر کرتے، اور یزیدیوں کی جھڑکیں سُنتے ہوئے چھتیس دن تک برداشت کیا، گلستانِ زہراؑ کے ان نازک پھولوں کی عرب کی جھلسا دینے والی دھوپ اور گرمی میں کیا حالت ہوئی ہوگی اور اس پر دمشق میں ایک سال تک تاریک زندانوں میں قید و بند کے مصائب، اتنا سب کرنے والوں کی حمایت کرنے والے اور دشمنانِ اہل بیت کو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دُعا دینے والے کس منہ سے روزِ آخرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شفاعت کی اُمید رکھتے ہیں، مولانا نجم الحسن کراروی لکھتے ہیں

> ''۱۰ محرم ۶۱ھ کا یہ اندوہناک حادثہ (المیہ) جس میں اٹھارہ بنی ہاشم اور بہتر اصحاب و انصار کام آئے، حضرت امام زین العابدین کو مدت العمر گھلاتا رہا اور مرتے دم تک اس کی یاد فراموش نہ ہوئی اور اس کا صدمہ جانکاہ دور نہ ہوا، آپ یوں تو اس واقعہ کے بعد تقریباً چالیس سال زندہ رہے مگر لطف زندگی سے محروم رہے اور کسی نے آپ کو بشاش اور فرحناک نہ دیکھا۔'' (۱)

اہل مدینہ کو جب امام زین العابدینؑ کی واپسی اور یزید کے ظلم وستم کا علم ہوا تو اُنھوں

۱۔ چودہ ستارے۔

نے بغاوت کر دی اور یزید کے گورنر عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو نکال باہر کیا، یزید نے مسلم بن عقبہ کو اہل مدینہ کی سرکوبی کے لئے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملے کا حکم دیا، ایک اور میدانِ کارزار گرم ہوا جس میں بہت سے اصحابِ رسولؐ شہید ہوئے، یزیدی لشکر نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا مسجدِ نبیؐ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں گھوڑے باندھے گئے اور دس ہزار سے زائد افراد کو تہہ تیغ کیا گیا، تاریخ کے صفحات یزید کی اس خون آشامی کو واقعہ حرّا کے نام سے اپنے یاد رکھے ہوئے ہے۔

دوسرا دور

یزید کی موت کے بعد اہل بیت رسولؐ کے مصائب کا پہلا دور ختم ہوا مگر اُن پر ظلم وستم مسلسل جاری رہا، حضرت ابوبکر کی بڑی بیٹی اسماء کا بیٹا عبداللہ ابن زبیر جو دشمنی اہل بیت میں خاصی شہرت رکھتا تھا حجاز مقدس میں خلیفہ بن بیٹھا، دوسری طرف شام میں معاویہ بن یزید نے اپنے باپ کے کرتوتوں کے خلاف محبتِ اہل بیت میں تختِ حکمرانی کو لات ماری تو بنی امیہ نے مروان بن حکم کو خلیفہ بنالیا، عبداللہ ابن زبیر نے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افراد سے زبردستی بیعت لینے کی کوشش کی اور اُن میں سے بعض افراد کو قید بھی کیا مگر حضرت مختار ثقفی کی فوج نے اُنھیں ابن زبیر کے چنگل سے چھڑالیا، مروان کے بیٹے عبدالملک نے حجاج بن یوسف کی مدد سے ابن زبیر کی خلافت کا خاتمہ کر دیا، ابن زبیر خانہ کعبہ میں محصور ہو گیا تھا جسے ختم کرنے کے لئے حجاج نے بیت اللہ پر زبردست سنگ باری کی اُسے بری طرح پامال کر دیا، اس فتح کے نتیجہ میں عبدالملک نے حجاج کو مدینہ کا گورنر بنا دیا، حجان بن یوسف تاریخِ اسلام کے چند سفاک ترین انسانوں میں شمار ہوتا ہے، روایات میں ہیں کہ اس نے ڈیڑھ سے پانچ لاکھ انسانوں کا خون کیا، گورنر بنتے ہی اس نے مدینہ منورہ میں ہر طرف تباہی پھیلا دی اور حضرت امام

زین العابدینؑ کو ایک مرتبہ پھر گرفتار کر کے دمشق بھیج دیا، جب ولید بن عبدالملک خلیفہ بنا تو اُس نے ۲۵ محرم الحرام ۹۵ ھ کو آپؑ کو مدینہ منورہ میں زہر دلوا کر شہید کر دیا۔

حضرت امام زین العابدینؑ کے ایک فرزند سیّد زید بن علی جنہیں تاریخ میں زید شہیدؒ کے نام سے جانا جاتا ہے بنی اُمیہ کے ظلم و ستم کو برداشت نہ کر سکے اور چالیس ہزار کوفیوں کا لشکر لے کر ولید بن عبدالملک کے مرنے کے بعد تختِ اموی پر بیٹھنے والے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ پر نکل پڑے، دغا باز کوفیوں نے احسان بن ثابت (امام ابوحنیفہ) کی تبدیلی بیعت کی وجہ سے اُن کا ساتھ عین میدانِ جنگ میں چھوڑ دیا اور حضرت زیدؒ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے، روایات میں ہے کہ حضرت ابوحنیفہ نے پہلے زید شہیدؒ کی بیعت کی مگر بعدازاں ہشام بن عبدالملک کے دھمکانے پر حکومت کے ساتھ جا ملے، چونکہ خود کوفی تھے اس لئے اُن کا اثر و نفوذ کوفیوں پر تھا، بنی اُمیہ کے حمایتیوں نے زید شہیدؒ کی لاش کو قبر کھود کر نکالا اور سر کاٹ کر ہشام کے پاس روانہ کر دیا باقی جسم کو چار سال تک سولی پر لٹکائے رکھا اور پھر جلا کر راکھ دریائے فرات میں بہا دی، اسی اُموی حکمران نے حضرت حسن مثنیٰ بن امام حسن علیہ السلام اور اُن کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہ بنت امام حسین علیہ السلام کو اپنی دادی حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر سے زبردستی بے دخل کیا، ولید کے کہنے پر لوگوں نے حضرت حسن مثنیٰ کے گھر کا سامان و اسباب زبردستی اُٹھا کر باہر پھینک دیا چنانچہ وہ مدینہ منورہ سے باہر جا کر رہنے پر مجبور ہو گئے۔

بنی اُمیہ کی نس نس میں امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور اُن کی اولاد سے دشمنی بھری ہوئی تھی، ہشام بن عبدالملک نے ایک دن حضرت امام باقر علیہ السلام کو مدینہ سے دمشق طلب کیا اور گویا ہوا کہ آپؑ کے دادا حضرت علی علیہ السلام نے غیب کا دعویٰ کیا تھا امامؑ کے جواب پر وہ سخت برہم ہوا اور اُنھیں قید میں ڈال دیا، جب امامؑ رہا ہوئے تو ہشام نے اپنے مدینہ کے گورنر ابراہیم بن عبدالملک کو کہا کہ اُنھیں زہر دے کر

شہید کر دیا جائے چنانچہ آپ کو ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو شہید کر دیا گیا، یہ اموی خلیفہ ۱۲۵ھ میں مرا تو ولید بن یزید بن عبد الملک حکمران بنا، یہ شخص بھی دشمنی اہل بیت اطہار میں مشہور ہوا اس کے دور میں سیّد زید شہیدؒ کے ایک بیٹے سیّد یحییٰ بن زید نے بنی اُمیہ کے مظالم کے خلاف مسلح جدو جہد کا راستہ اختیار کیا مگر وہ بھی شہید ہوئے اور ولید بن یزید بن عبد الما لک نے اُن کا سر اور ہاتھ پاؤں قطع کرانے کے بعد لاش کو خراسان میں ہتھوڑوں سے کوٹ کر دریا فرات میں بہا دیا، جناب زید کے دیگر دو فرزند روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے اور وہ کسی پر اپنا حسب و نسب بھی ظاہر نہ کر سکتے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں بنو اُمیہ کی حکمرانی کا زوال شروع ہوا اور بنو عباس اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے بنو اُمیہ کے اہل بیت رسولؐ پر مظالم کا پرچار کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور انتقام آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نعرہ بلند کیا، مظالم سے تنگ آئے ہوئے شیعانِ اہل بیت بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے لیکن اس تحریک کو امام جعفر صادق علیہ اسلام کی کوئی اعانت حاصل نہ تھی بلکہ بنی عباس نے حضرتِ امام کی بیعت کر کے اپنی تحریک کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی مگر امامؑ نے صاف انکار کر دیا، مگر اولادِ امام حسن علیہ اسلام میں سے ایک سیّد زادے عبد اللہؒ اور اُن کے دو بیٹے محمد نفس ذکیہؒ اور ابراہیمؒ کی حمایت عباسیوں کو حاصل تھی، چنانچہ ۱۳۲ھ میں ابو العباس سفاح بن عبد اللہ عباسی کو سلطنتِ عباسیہ کا پہلا خلیفہ مقرر کیا گیا جس نے اپنے بھائی منصور دوانیقی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا، سفاح کے تقریباً چار سالہ اقتدار کے بعد منصور حکمران بنا۔

بنی عباس اولادِ رسولؐ کے لئے بنی اُمیہ سے بھی بدتر دشمن نکلے، منصور عباسی کا نام ابو جعفر عبد اللہ المنصور ابن محمد تھا اور وہ خاندانِ بنو عباس کا دوسرا آمر تھا، خاندانِ بنو عباس نے عرب پر ۷۵۴ء سے ۷۷۵ء تک اپنا تسلط جمائے رکھا، اس نے عباسی آمریت کی

جڑیں مضبوط کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور یہ ہی وجہ ہے کہ اسے عباسی سلطنت کا اصل بانی سمجھا جاتا ہے۔ منصور نے ہی دارالخلافہ بغداد منتقل کیا، وہ ایک بربر لونڈی کے بطن سے اُمیّہ کے مقام پر پیدا ہوا جو حجاز سے ۶۸۷ء میں ہجرت کرنے کے بعد عباسیوں کا مسکن بنا تھا، اقتدار میں آنے کے بعد منصور کو بہت سی شورشوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے ایک کی قیادت خود منصور کے چچا عبداللہ نے کی، بنوامیّہ کے خلاف تحریک میں جن چیدہ چیدہ لوگوں نے عباسیوں کا ساتھ دیا تھا ان کو تہہ تیغ کرنے کا کام منصور نے اپنے بھائی سفاح کے دورِ اقتدار میں ہی شروع کر دیا تھا تاکہ حکومت تحریک کے نعرے کے مطابق اس کے اصل حقداروں یعنی اہل بیتِ رسولؐ کے حوالے نہ کرنی پڑے، اس کام میں منصور کا ساتھ ابو مسلم نامی شخص نے دیا جس نے بنوامیّہ کے خلاف تحریک منظّم کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا تھا مگر اقتدار میں آنے کے بعد منصور نے اپنے تمام رفقا کاروں کو جن میں ابو مسلم بھی شامل تھا قتل کروا دیا، اس صورتِ حال میں شیعانِ اہل بیتِ رسولؐ مایوس اور رنجیدہ ہوئے، خصوصاً نفس ذکیہ اور ابراہیم بڑے بددل ہوئے جب انہیں یقین ہوا کہ منصور اہل بیتِ اطہارؑ کو ان کا حق نہیں دے گا تو وہ ۷۶۲ء میں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، پورے ملک میں علمِ بغاوت بلند ہوتا دیکھ کر منصور نے فوج استعمال کی اور سادات اور ان کے حمایتیوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا، سیّدوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں، بہت سے سادات کو بغداد میں زندہ دیواروں اور بنیادوں میں چنوایا اور زندانوں میں ڈلوایا گیا، تاریخ یہ بھی کہتی ہے کہ سیّدوں کے خون سے گارا بنا کر عمارتیں تعمیر کرائی گئیں، اُسے اگر کسی پر بھی سیّد یا شیعہ ہونے کا شبہ ہو جاتا تو اُسے قتل کرا دیا جاتا تھا، علامہ مجلسیؒ کے حوالے سے مولانا نجم الحسن کراروی لکھتے ہیں:

''منصور کے زمانہ میں بے شمار اولادِ علی شہید کئے گئے اور بہتوں کو دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا، منصور اس زمانہ میں بغداد میں محل بنوا رہا تھا، اس میں جہاں اوروں کو اس نے زندہ چنوا دیا تھا ایک حسنی نوجوان کو بھی چنوا دیا، وہ چونکہ بہت ہی حسین وخوبصورت تھا اس کے چہرہ پر جب معمار کی نظر پڑی تو بیساختہ اُس کا دل رونے لگا، حکم سے مجبور تھا، دیوار میں چنتے چنتے اُسے موقع مل گیا بولا کہ اے فرزند رسول آپ گھبرائیے نہیں میں سانس کے لئے سوراخ چھوڑے دیتا ہوں اور رات کو آ کر آپ کو رہا کر دُوں گا، چنانچہ وہ رات کی تاریکی میں دیوار کے قریب آیا اور اینٹیں ہٹا کر اس نونہالِ باغ رسالت کو دیوار سے نکال دیا اور کہا کہ آپ صرف اتنا کیجیے کہ اس طرح زندہ بچ کر کسی طرف چلے جایئے کہ آپ کا پتہ نشان نہ مل سکے اور اے فرزندِ رسولؐ آپ اپنے نانا محمد مصطفیٰؐ سے میری بخشش کی سفارش فرمائے گا۔ انھوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اے شیخ اگر تجھ سے ہو سکے تو میری زلفوں کو تراش لے اور کسی رات کو میری دُکھیاری ماں کے پاس فلاں محلّہ میں جا کر اُنھیں میری زلفیں دے کر کہہ دے کہ میں زندہ ہوں اور عنقریب ملوں گا، اس معمار کا بیان ہے کہ میں ان کی خواہش کے مطابق ان کے مکان پر پہنچا تو ان کی ماں بیٹھی رو رہی تھیں، میں نے انھیں ثبوتِ حیات کے لئے زلفیں دے کر نویدِ زندگی سُنائی اور واپس چلا آیا'' (۲۴)

ا۔ چودہ ستارے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہمیشہ عبادت وتبلیغ دین میں وقت گزارتے تھے مگر پھر بھی وہ منصور کی نظروں میں کھٹکتے تھے اور اُس نے کئی بار اُن کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے، اُنھیں کئی بار دربار میں طلب کیا گیا اور آخر کا ۱۵ شوال ۱۴۸ھ میں زہر سے شہید کر دیا گیا۔

منصور چونکہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کے اثر ورسوخ کو جانتا تھا چنانچہ ان کے تمام اہل خانہ کو مدینہ سے گرفتار کر کے اسیران کربلا کی طرح کی تکالیف واذیت سے گزار کر بغداد کے قید خانوں میں پہنچا دیا گیا، ان سیّدوں میں سے بعض کی موت ان ہی قید خانوں میں ہوئی مگر اُن کی نعشیں وہیں پڑی رہیں اور تدفین نہ ہونے دی گئی، جناب عبداللہ اور اُن کے دونوں بیٹے روپوش رہے اور منصور کے خلاف فوج اکٹھی کرتے رہے، بعد ازاں نفس زکیہؒ نے مدینہ پر قبضہ کر لیا مگر منصور کی فوج کے ساتھ ایک مقابلہ میں شہید ہو گئے، ان کے والد عبداللہؒ قید میں بیٹے کا کٹا ہوا سر دیکھ کر راہ حق کو لبیک کہہ گئے، ابراہیمؒ پانچ برس تک روپوش رہے اور آخر کار مصر کی حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، منصور کے خلاف جنگ کے لئے ابراہیمؒ ایک بڑا لشکر لے کر کوفہ کی طرف آئے مگر وہ بھی جنگ میں شہید ہو گئے۔

منصور دوانقی کے واصل جہنم ہونے کے بعد مہدی عباسی اور پھر اُس کا بیٹا ہادی عباسی تختِ حکومت پر بیٹھا، یہ بھی بدترین دشمنانِ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے تھا، دونوں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ اسلام کو اپنے درباروں میں بلایا اور کئی بار ان کے قتل کا ارادہ کیا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے، ہادی عباسی کے زمانہ میں مدینہ میں مقیم اولادِ امام حسن علیہ السلام پر جھوٹے الزام لگا کر اُنھیں مارا پیٹا گیا اور اُن کے گلوں میں رسیاں ڈال کر بازاروں میں گھمایا گیا، ان سادات میں ایک نمایاں شخصیت جناب حسین بن علیؒ تھے جو حضرت حسن مثنیٰؒ کے پڑپوتے تھے، ان کو شہید کر کے ان کا سر کاٹ کر

بغداد بھیجا گیا۔
شیعہ محقق علی حسین رضوی لکھتے ہیں:

’’کہنے کو حد نظر بلکہ حد علم تک شیعہ علی نام کا کوئی متنفس کہیں پایا نہ جاتا جو جس مقام پر بھی تھا، دھیمی دھیمی سانسیں لیتا ہوا جی رہا تھا، انفرادی اور اجتماعی قتل کا معمول جاری تھا پھر بھی آئے دن کہیں نہ کہیں چند سید زادے بے چارگی سے قتل ہونے پر ظالموں کو موت کا مزہ چھکا کر مر جانے کو ترجیح دیتے تھے۔‘‘ (۱)

ہادی کے مرنے کے بعد اُس کا بھائی ابوجعفر ہارون رشید سلطنتِ عباسیہ کا حکمران بنا جو بقول ابن خلدون اپنے دادا منصور دوانقی کے نقش قدم پر چلتا تھا اور سادات کُشی میں کسی سے کم نہ تھا، اس بادشاہ نے باقاعدہ غنڈے پال رکھے تھے جن کا کام اولادِ رسول اور اُن کے شیعوں کو تلاش کر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنانا تھا، اس نے جناب نفس زکیہ کے ایک بھائی یحییٰ بن عبداللہ کو زندہ دیوار میں چنوایا، اسی ملعون نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے مزار پر لگے ہوئے بیری کے درخت کو کٹوایا اور قرآن سے انحراف کرتے ہوئے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ اسلام سے کہا کہ وہ اولادِ رسول نہیں بلکہ اولادِ علی ہیں، یہ شخص اپنے اجداد کی طرح اس اندیشہ میں مبتلا رہا کہ کہیں امامؑ لوگوں سے بیعت لے کر اُس کے خلاف تحریک کا آغاز نہ کر دیں چنانچہ اُس نے امامؑ کو قید کر دیا، ہارون رشید نے اپنے ایک معتمد حمید ابن قحطبہ طوسی کے ذریعے ساٹھ سے زائد سادات کو جو کہ اُس کے حکم سے قید تھے قتل کروایا، ایک مرتبہ تو حضرت امامؑ کو حالتِ نماز میں مسجد نبوی سے گرفتار کر لیا

۱۔ تاریخ شیعانِ علیؑ

گیا اور بصرہ میں ایک سال سے زائد مدت تک قید رکھنے کے بعد بغداد منتقل کر دیا گیا جہاں سندی ابن شالک کے ذریعہ سے امامؑ کو زہر دے کر ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو شہید کر دیا گیا شہادت کے بعد آپؑ کی نعش مبارک نکال کر بغداد کے پل پر رکھ دی گئی، اسی دوران سلیمان بن جعفر ابن ابی جعفر نے اپنے ساتھیوں سمیت دشمنانِ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ سے آپؑ کی نعش مبارکہ چھین کر دفن کی۔

امام موسیٰ کاظم علیہ اسلام کے شہادت کے بعد ہارون رشید کے امام رضا علیہ اسلام کو اپنے ظلم و جبر کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور اس کام میں حضرت امامؑ کے چچا محمد ابن جعفر صادق علیہ اسلام کا ہارون کے خلاف خروج ایک بہانا بن گیا، ہارون نے عیسیٰ جلودی کی معیت میں ایک بھاری لشکر مدینہ روانہ کیا جس نے ہر ممکن کوشش کی کہ اولادِ رسولؐ کو تباہ و برباد کر دے، عیسیٰ جلودی نے امام رضا علیہ السلام کا سارا اثاثہ، خواتین کے جواہرات اور بچوں کی تمام تر اشیاء لوٹ لیں، محمد بن جعفر صادق علیہ السلام نے اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر بعد میں گرفتار کر کے بغداد روانہ کر دیئے گئے۔ امام حسن علیہ السلام کی اولاد سے ایک شہزادہ ادریس بن عبداللہ ایک عباسی افسر کی مدد سے مدینہ سے نکل کر مراکش پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور اُنھوں نے مغرب اقصیٰ میں پہلی شیعہ حکومت کی بنیاد رکھی۔ بعد کے کچھ سال ہارون اپنے بیٹوں امین اور مامون کے درمیان اقتدار کی کشمکش کے ہاتھوں انتشار کا شکار رہا اور اس کے بعد چار سال تک دونوں بھائی آپس میں جنگیں کرتے رہے جو مامون کی کامیابی پر منتج ہویں، اس تمام عرصہ میں عباسی حکمران آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیعان علیؑ کی طرف توجہ نہ کر سکے، بعد ازاں ملک میں یورشیں شروع ہو گئیں جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ سادات بھی حکومت کے خلاف سرگرمِ عمل ہو گئے ان میں اکثریت حضرت حسن مثنیٰ کی اولاد اور فرقہ زیدیہ کے افراد تھے، اسی دوران بنی شیبان کا ایک فوجی سردار ابوالسرایا سری بن منصور شیبانی نے ایک

منظّم فوج کشی کے ذریعہ سے عراق پر قبضہ کرلیا اور حضرت امام رضا علیہ السلام کے نام سے سکے بھی جاری کروا دیئے ، ابوالسرایا کا کردار مورخین نے مسخ کر کے بیان کیا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ آلِ محمدؐ کا طرفدار ضرور تھا، عباسی اس علاقہ میں زیرِعتاب آئے اور اُن کے گھروں کو بھی نذرِ آتش کیا گیا اور بہت سوں کو تہہ تیغ بھی کیا گیا، ابواسرایا نے حسین بن حسن ابن امام زین العابدین علیہ السلام کو مکہ کا اور ابراہیم بن موسیٰ کاظم علیہ السلام کو یمن کا گورنر بنا دیا، ابواسرایا کئی ماہ تک اقتدار میں رہا اور ایک جنگ میں کام آ گیا، اس کے جاں بحق ہوتے ہی ہر طرف خانہ جنگی شروع ہوگئی ، حالات کو دیکھتے ہوئے مامون نے مصلحتاً مدینہ سے حضرت امام رضا علیہ السلام کو بلایا اور اُن کے انکار کے باوجود اُنھیں اپنا ولی عہد بنا دیا تاکہ اپنے خلاف اُٹھنے والی تحریک کے زور کو توڑ سکے، مامون نے اس کے بعد حضرت امام کو زبردستی خراسان کا گورنر بنا کر بھیج دیا، اس قدم نے دیگر افرادِ بنوعباس کو مامون سے بدظن کر دیا اور اُنھوں نے بغداد میں بغاوت کر کے ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ بنا لیا، ان شورشوں سے نمٹتے ہوئے مامون نے آخرکار حضرت امامؑ کو انگوروں میں زہر ڈال کر ۲۳ ذی قعدہ ۲۰۳ء کو مقامِ طوس میں شہید کر دیا، اس طرح اُس نے پہلے امام کو ولی عہد بنا کر علویوں کی شورش کو رفعہ کیا اور بعد ازاں امام کو شہید کر کے بدظن عباسیوں کی مخالفت کو دور کر دیا۔

تیسرا دور

کتاب کے اس حصّہ میں ہم دیگر آئمہ طاہرین علیہم السلام اور عربستان میں ان کے محبان کے عباسی حکمرانوں کے ہاتھوں مصائب اور تکالیف سے ہٹ کر خراسان ، اور سجستان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ وہ علاقے ہیں جہاں محبان اہل بیت اور کاظمی سادات کی ایک کثیر تعداد آباد ہوگئی تھی ان کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم وستم کو مختلف ادوار میں

چھپایا جاتا رہا ہے، یہ ہی وہ علاقے ہیں جہاں رسول اللہ کی اولاد اور ان کے ماننے والوں پر عرصہ حیات اتنا تنگ کیا جاتا رہا کہ ایک بڑی تعداد بار بار ہجرت پر مجبور ہوئی اور تقیہ کے لبادہ میں اپنے عقیدے اور نسب کو چھپاتے ہوئے بہت سے سیّد وارد ہندوستان ہوئے، وسطی ایشیاء کے ان علاقوں میں، سمرقند، بخارا، ترمذ، اور بلخ کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔

عباسیوں کے آخری دور میں سلطنت کے ٹکڑے ہونے شروع ہو گئے تھے اور مغربی اور مشرقی حصّوں میں مقامی حکومتیں بننا شروع ہو گئیں تھیں، اس کی بنیادی وجہ خلیفہ کے مذہبی اختیارات کا نہ ہونا اور آلِ رسولؐ اور اُن کے شیعوں کے خلاف ظالمانہ رویہ تھا، روایات میں ہے کہ کم وبیش چارسوسال تک مولا علیؑ اور شیعان علیؑ پر انداز بدل بدل کر تبرابازی کی جاتی رہی، تاریخ شیعان علیؑ کے مئولف لکھتے ہیں:

''حضرت علی علیہ السلام پر تبرا بنواُمیہ نے جاری کیا، دورِ بنو عباس میں بھی اکثریت نے اس روش کو اپنائے رکھا، ان کے بعد سلجوقیوں، ایوبیوں، اور غزنیوں نے بھی علی اور اولادِ علی پر تبرابازی جاری رکھی، سلاطین مابعد نے اس میں اتنی تبدیلی کر دی کہ علیؑ کے بجائے علیؑ کے پیرووں کے نام لینے لگے. تبرا کی محفلوں میں ایک شخص منبر پر جاتا اور آواز لگاتا

فلاں ابن فلاں رافضی بود!

حاضرین جواب دیتے:

بر پدرش لعنت'' (۱)

۱۔ تاریخ شیعانِ علیؑ

یہ ہی حالات بنیادی وجہ تھے اولادِ امام زادہ امیر اسحاق الموافقؒ ابن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے مشہد سے نکل کر سینکڑوں میل دور بلخ کے تاریخی شہر ہجرت کر جانے کے، ایک طرف دشمنوں کے ظلم وستم سے بچنا تھا تو دوسری طرف اُس جدوجہد کو جاری رکھنا تھا کہ جس کی پاداش میں وہ جور و جبر کا شکار بنائے جا رہے تھے، ساداتِ کرام کی جدوجہد تو سارے ادوار میں یہ ہی رہی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہارؑ کا پیغام مسخ نہ ہو اور اُس کی برابر تبلیغ واشاعت ہوتی رہے، یہ فریضہ تاہم وقت کے ساتھ مشکل تر ہوتا گیا۔

سادات کاظمیہ کے بلخ پہنچے کے بعد ایک اور طوفانی دور آیا، عباسیوں کی حکومت کے بخیے ادھڑنا شروع ہوئے اور مقامی سرداروں اور گورنروں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرنا شروع کر دیں، بغداد سے کابل تک سارے خراسان اور ماوراء النہر میں ایک ہنگامہ سا برپا رہا، جگہ جگہ لڑائیاں ہو رہی تھیں طاہریوں، علویوں، صفاریوں، سلجوقیوں، ایوبیوں، سامانیہ اور غزنویوں نے مختلف علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے جتنوں میں مصروف تھے، چھوٹے چھوٹے علاقے کبھی ایک کے قبضہ میں ہوتے تو کبھی دوسرے کے، ان جنگی سرداروں میں کچھ محبانِ اہل بیت بھی تھے اور جن علاقوں پر اُن کا قبضہ ہو جاتا وہاں سادات ومومنین کے لئے قدرے آسانیاں پیداء ہو جاتیں، خراسان کی شکل میں سب سے پہلے ابو مسلم خراسانی نے دورِ بنی اُمیہ میں ایک ایسا گوشہ محبان علیؑ کو مہیا کیا تھا جہاں وہ قدر سکون کے ساتھ رہ سکتے تھے، پھر مامون الرشید کے دور میں طاہر بن حسن خراسان کا گورنر بنا اور اس علاقہ میں شیعوں کو قدرے سکھ کا سانس نصیب ہوا، طاہر کا خاندان ایک مدت تک خراسان میں حکمران رہا، بظاہر وہ عباسیوں کے ماتحت تھے مگر محبان اولادِ علی تھے اور کھل کر بغداد سے طاقت آزما نہیں ہو سکتے تھے، علی حسین رضوی کہتے ہیں:

''عراق وایران کے افق تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو دوسو سال کی مسلسل سرفروشی کے بعد شیعوں کی پہلی مستقل پناہ گاہ طاہر بن حسین کی حکومت تھی جس میں طاہر کی گورنری سے آل طاہر کی بادشاہت تک کوئی پچھتر سال اس مظلوم فرقے نے اطمنان کا سانس لیا۔'' (۱)

جیسے جیسے عباسی حکومت کمزور پڑتی جارہی تھی دیگر علاقوں کے گورنر بھی خودمختاری اختیار کرتے جارہے تھے اور طوائف الملوکی بڑہتی جارہی تھی، اس عرصہ میں ایک شیعہ صالح بن نصر کنعانی خارجیوں سے محبان اہل بیت کا دفاع کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا اور خراسان کے بعض حصّوں پر قابض ہوگیا مگر اُس کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور اس کے لشکر نے یعقوب بن لیث کو ۲۵۱ھ میں اپنا سربراہ بنا لیا جس نے سجستان میں اپنی یعنی خاندانِ صفاریہ کی حکومت قائم کی لیکن اسے آرام سے بیٹھنے کا موقع نہ ملا، وہ کابل پر بھی قابض ہوگیا تھا تاہم اس کی تمام عمر خارجیوں اور دیگر شوریدہ افراد سے جنگوں اور بغداد کی منافقانہ سیاست کی نظر ہوگئی، وہ ۲۶۵ھ میں فوت ہوا، اس کا جانشین عمرو بن لیث محبت اہل بیت میں ڈوبا رہتا تھا اور اپنے لشکر کے معائنہ کے دوران اکثر یہ کہتا تھا کہ کاش یہ لشکر میدانِ کربلا میں ہوتا۔

اسی طرح حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد میں سے جناب ابوالحسن یحییٰ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کوفے پر قبضہ کرلیا مگر وہ خلیفہ بغداد کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے، علاقہ رے میں شیعانِ علی نے حسن بن زید کے ہاتھ پر بیعت کرکے ۲۵۰ھ میں ایک الگ ریاست کی بنیاد رکھی مگر یہ بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی، خلافتِ بغداد پر کچھ

۱۔ تاریخ شیعانِ علیؑ

عرصہ کے لئے خاندانِ بنی بویہہ بھی قابض ہوا جو کہ محبّ اہل بیت تھا، شاہ معین الدین ندوی اپنی کتاب تاریخِ اسلام میں بیان کرتے ہیں کہ اس خاندان کا اصل بانی علی بن بویہہ الملقب عماد الدولہ والی فارس تھا،معز الدولہ اس کا چھوٹا بھائی تھا اس کے حصّے میں کرمان کا علاقہ آیا تھا لیکن خلافت بغداد کی تولیت کا جلیل القدر منصب اس کی قسمت میں تھا ۳۲۴ھ میں اس کو یہ منصب ملا، ۳۵۶ھ میں اس کا انتقال ہوا اس طرح اس نے گویا ۲۶ سال تک خلافت بغداد کی فرمانروائی کی، وہ مزید لکھتے ہیں:

''دولتِ عباسیہ کے بہت سے وزراء اور متوسل عجمی اور شیعہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے علانیہ شیعت کی ترویج واشاعت کی جرات نہ کی تھی .معز الدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعت کی تبلیغ کردی۔'' (۱)

معز الدولہ کا نام منکرین اہل بیت کے لئے ایک دکھتی رگ ہے کیونکہ اس نے وہ قدم اُٹھائے جن سے شیعوں کو قدرے کھل کر سامنے آنے کا موقع ملا، چنانچہ اس کے کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ معز الدولہ نے عیدِ غدیر کا جشن مناتے ہوئے ۱۸ ذی الحجہ کو شہر بھر میں چراغاں کروایا، اسی نے ۳۵۳ ہجری میں عاشورہ کربلا کی یاد میں پہلا جلوسِ عزاداری نکالا، مخالفین اس کو برداشت نہ کرسکے اور فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا اور بڑی خون ریزی ہوئی۔

بغداد سے اوپر خراسان اور طبرستان، ویلم اور دیگر وسطی ایشیائی علاقوں میں وقفے وقفے سے ایسی حکومتیں بنتی رہیں جن کو اولادِ علی اور اُن کے شیعوں نے اپنے لئے جائے پناہ سمجھا

۱۔ تاریخ اسلام۔ از شاہ معین الدین ندوی

اور بڑی تعداد میں ان علاقوں میں آباد ہونے لگے لیکن ہمیشہ کی طرح انھیں سکون کہیں بھی نصیب نہ ہوا اور دشمن ظاہری اقتدار کی لالچ میں اُن کا تعاقب کرتے رہے اور جگہ جگہ اُن کا خون پانی کی طرح بہتا رہا وہ ظلم وتشدد کا نشانہ بنتے رہے اور اُن کی محرومی بدستور برقرار رہی، یہ سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا کہ موجودہ افغانستان کے شہر غزنی تک محبان اہل بیت پر تبرا بازی کی جاتی تھی اس شہر کے گلی کوچوں میں درودیوار پر لعن طعن لکھی جاتی تھی، ادھر ترکوں نے ۳۵۶ھ میں بنی بویہہ کے ساتھ جنگ شروع کی اور سنی مسلمانوں نے ترکوں کا ساتھ دیا اور اہل تشیع کو نہ صرف خون میں نہلایا گیا بلکہ اُن کے گھر بار بھی لوٹ لئے گئے، بنی بویہہ حکومت کا عملاً خاتمہ محمود غزنوی کے ہاتھوں اُس وقت ہوا جب وہ بغداد پر قابض ہوا، اس دوران چھوٹی چھوٹی شیعہ حکومتوں کے درمیان بھی ٹھن گئی اور خاصی خون ریزی ہوئی، دوسری طرف اہل سنت کے فرقوں کے درمیان بغداد و قاہرہ میں کشت وخون ہوا اور اقتدار کی جنگوں میں غزنویوں، سلجوقیوں، اور غوریوں نے دل کھول کر انسانیت کا خون کیا، محمود غزنوی جو کہ ترک النسل تھا اُس نے اصفہان کو تہس نہس کیا اور ہزاروں افراد کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا، محمود نے بلخ کو دارالحکومت بنایا جس کو اس کے انتقال کے بعد ۴۳۱ھ میں جغری بیگ داود نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ گھیرے میں لے لیا، محمود کے جانشین مسعود غزنوی نے بڑی مشکل سے ایک ہولناک جنگ کے بعد بلخ کو واگزار کرلیا، بغداد میں ۴۴۶ھ میں شیعہ سنی بلوہ ہوا جس کے ردِعمل میں رونما ہونے والے واقعات کے نتیجہ میں مشہد شہر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا، محمود غزنوی کٹر سنی العقیدہ تھا اور لوٹ مار اور وسعتِ سلطنت کی لالچ میں ڈوبا ہوا شخص تھا، اس کی شیعہ دشمنی کی وجہ سے ہی دیگر اسلامی فرقے اُسے سلطان محمود غزنوی کہہ کر بلاتے تھے۔

''ہمیں دمشق و بغداد کے بعد غزنی کے ایوان سادات کے خون سے رنگین دکھائی دیتے ہیں...اس کو تو اکثر مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ سلطان محمود کو شیعوں سے سخت دشمنی تھی، وہ ان کی پرچھائیں تک برداشت نہ کرسکتا تھا... بنی امیہ نے جو کچھ سادات کے ساتھ کیا تھا غزنی میں اسکی پوری تقلید کی گئی اور دور دور تک جہاں کہیں علیؑ کے دوستوں کا پتہ چلا،کوشش کر کے انکا قلع قمع کر دیا گیا..تبرا میں غزنی دمشق کی پوری تقلید نہ کر سکا کیونکہ دمشق میں ستر ہزار منبروں سے علیؑ اور اولادعلیؑ کو برا کہا جاتا تھا غزنی میں صرف ایک محفل منعقد کی جاتی تھی اور اس میں نام بنام لعنت بھیجی جاتی تھی،'' (۱)

مورخین لکھتے ہیں کہ محمود نے محبّ اہل بیتؑ شنب بن حریق کی اولاد کو غور اور فیروزہ کوہ کے علاقوں میں تباہ و برباد کیا، اس نے بہت ساروں کو قتل اور جلا وطن کیا جو باقی بچے وہ تقیہ اختیار کر کے انتہائی بدحالی میں زندہ رہے، شنب بن حریق حضرت علی علیہ اسلام کی ظاہری خلافت کے دوران سیستان میں حکمران تھا اور کوفہ جا کر امیر المومنینؑ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا، یہ خود اور اس کی ساری اولاد شیعہ تھی۔

بلادِ عرب سے لے کر خراسان اور وسطی ایشیائی علاقوں میں پھیلی ہوئی اسی شورش اور خون ریزی کے دوران تاتاری حملے شروع ہو گئے اور سارا عراق، ایران، اور شام تباہی و بربادی کا شکار ہو گیا، صرف بغداد میں سولہ لاکھ افراد کو قتل کیا گیا، تاتاری لشکر نے ۲۰ محرم ۶۵۶ھ (۲۷ جنوری ۱۲۵۸ء) میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم کو اُسکے خاندان سمیت تہہ تیغ کر دیا، چنگیز خان اور ہلاکو خان کے بعد ایک دوسرا دورِ طوائف الملوکی آیا

۱۔ تاریخ شیعان علی۔ صفحہ ۴۲۲۔۴۱۸

حتیٰ کہ تیمور نے اپنے اقتدار کی ابتدا ۷۶۱ھ میں سبزوار اور کش سے کی اور پھر افغانستان اور ماوراءالنہر پر قبضہ کرلیا، اس کا دارلحکومت سمرقند تھا، کچھ مورخ اسے شیعہ لکھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ شیعہ تھا اور نہ سنی وہ فقط ایک حکمران تھا اور اسے جس سے بھی خطرہ محسوس ہوا اُسے اس نے کچل ڈالا، تیمور کے قتال اور شر کے خوف سے بہت سے سادات اس کی سلطنت چھوڑ کر دوسرے علاقوں کو ہجرت کر گئے۔ عباسیوں کے آخری دور سے لے کر ایران میں نادرشاہ کے دور تک وسطی ایشیاء میں جنگ و جدل، اقتدار کی دوڑ، انسان کو کیڑے مکوڑوں کی طرح ذبح کرنا، شہروں اور بستیوں کو تاراج کرنا تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاری رہا، محبانِ اہل بیت، سادات، اور دیگر امن پسند افراد ایک جگہ سے دوسری جگہ کو محفوظ سمجھ کر ہجرت کرتے رہے، کچھ تو اتنے بددل ہو گئے کہ اس علاقے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر ہندوستان کی طرف نکل گئے مگر دین کی تبلیغ کو انھوں نے ہر حال میں مقدم جانا اور جہاں بھی گئے علم و دین کے قطب بنتے گئے۔

تصوف و طریقت

اس کائنات کا مقصد ومحور معرفت الٰہیہ ہے اور اس تک رسائی کا ذریعہ پروردگار عالم کا پسندیدہ اور خود فراہم کردہ دین ہے، اسلام کا یہ بنیادی تقاضہ ہے کہ اس پر مکمل عمل کیا جائے، اس کے ماننے والے اپنی اختراعات کے ذریعے دین میں پیوند کاری نہ کریں اور صدق دل سے ایک ایسا انسانی کردار وشخصیت پیدا کریں جو معرفت وحکمت اور زیرکی میں نہال ہو، اسی لئے اللہ رب العزّت نے اس دین کو انسان تک پہنچانے کے لئے پہلے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کا تعارف کروایا اور پھر اس کردار کی عظمت کے سہارے اپنی ہدایت کو انسانوں تک پہنچایا، یہ کردار اتنا باعظمت ہے کہ اس کو تمام مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کے لئے نمونہ قرار دیا۔

اسلام کی اساس میں غائب پر ایمان، عبادات کی بجا آوری، علم کا حصول، تقویٰ، اور درست اور پرامن اسلامی معاشرت کا قیام شامل ہے، احسن الخالقین نے مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اعلانِ عام کروایا کہ اللہ کے رسولؐ اُن کی عترت اور قرآن حکیم فرقان حمید سے توسل رکھو۔

اسلام پر دل کی بھرپور حقانیت سے عمل انسان کو ایمان، حقیقت، یقین، اور معرفت کی منازل طے کراتا ہے، یہ دین انسان کی مادی اور روحانی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اسی لئے اسے دینِ فطرت کہا جاتا ہے، اسلام میں روحانیت کو مادیت سے الگ کر کے علیحدہ شعبہ کا درجہ نہیں دیا گیا بلکہ یہ دین انسان کے تمام پہلوں اور ضرورتوں کو نہ

صرف ایک اکائی کی طرح پورا کرتا ہے بلکہ اُس کی تمام صلاحیتوں کو ایک ساتھ پلتے اور بڑھتے دیکھنا چاہتا ہے، جو لوگ انسانی مادیت کو معرفت کے راستے میں رکاوٹ جانتے ہیں ایک بڑی نادانی کا شکار ہیں، ان احباب کو پہلے انسان کی ماہیت کو اور پھر دین کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے، ایسے تصورات، نظریات، اور فلسفے جو اسلام کے بنیادی ارکان سے متصادم ہوں اُن کی اس دینِ حق میں کیسے جگہ ہو سکتی ہے، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس دین کی اپنی ایک شناخت، نظریہ اور فلسفہ ہے جس کی توضیح و تشریح کے لئے کسی دوسرے مذہب و معاشرت سے نظریات و فلسفہ مستعار لینے یا اختیار کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، اس کے ہر حکم و قانون کی تشریح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فکری اور عملی دونوں طرح سے تعلیم کر دی ہے، یہ تعلیم مسلمان کو ایک ایسے عباداتی، معاشرتی، اور علمی نظام سے منسلک کرتی ہے جو دین اور دُنیا دونوں میں اُسے کامیابیاں عطا کرتی ہے، اسی لئے دین اسلام کے دو حصّے ہیں جنہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کہتے ہیں، عبادات کو حقوق اللہ میں شامل کیا جاتا ہے اور حقوق العباد کا تعلق مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے ہے جن کی مکمل بجا آوری اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان ایک درست اور مکمل اسلامی زندگی نہ گزارے، حد تو یہ ہے کہ فرض نمازوں کا باجماعت ادا کرنا بھی انفرادی ادئیگی سے افضل قرار دیا گیا ہے تا کہ انسان کے معاشرتی روابط و اور جزبہ اخوت میں اضافہ ہو، اسی طرح دیگر عبادات میں بھی معاشرتی پہلوں کو نمایاں مقام حاصل ہے، لہٰذا دینِ اسلام مسلمانوں کو نام نہاد روحانی یا دماغ کی غیر مرئی طاقتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے گوتم بدھ بننے کی اجازت نہیں دیتا۔

ظہورِ اسلام کے بعد طویل مدت تک مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) مخلوق اور خالقِ کائنات کی حقیقت تک رسائی کے لئے فقط روحانی طاقتوں اور کوششوں پر انحصار کرنے والی کوئی تحریک جنم نہ لے سکی، وجوہات بالکل واضح ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مساجد کے ساتھ ساتھ خانقاہوں اور دیگر روحانی مراکز کی تعمیر بھی کراتے ، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں میں غیر اسلامی فلسفہ راہ نہ پا سکا اور حقیقی مسلمان مکمل یکسوئی اور یقینِ کامل کے ساتھ اسلام کی اصل تعلیمات پر عمل پیراں رہے، گمراہی اور پراگندہ خیالی نے مسلمانوں کو اُس وقت گھیرا جب پیغمبرِ اسلام سے براہ راست مستفید ہونے والے کبار صحابہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے اور اہل بیتِ رسول کا در چھوڑ کر دینی احکام و مسائل کی تشریح کے لئے نام نہاد علماء و مفسرین کی تقلید شروع کر دی گئی ، اسی زمانہ میں فتوحات نے مختلف علمی اور تہذیبی ترقی کی حامل اقوام کو مسلمانوں کے زیرِ نگیں کیا ،لوگوں کی ایک اکثریت کی توجہ اسلام کی اصل تعلیمات سے ہٹ کر دیگر مذاہب کی تعلیمات پر مرکوز ہونا شروع ہوگئی ، سیاسی خلفشار تو پہلے ہی سے موجود تھا اب ذہنی خلفشار کے دروازے بھی کھل گئے ، نتیجۃً فکری مسائل اور نظریات کی تشریح کے لئے درِ رسولؐ کے پروردہ اہلِ علم اصحاب اور اہلِ بیت رسولؐ کو چھوڑ کر دوسری اقوام و مذاہب کے نظریات اور فلسفہ کی طرف رغبت کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوگیا ، ایسی بعض کوششیں کچھ تو کم علم اور دیگر مذاہب کو چھوڑ کر مسلمان ہونے والے افراد کے نادانستہ افعال کا شاخسانہ تھیں اور بعض کے پیچھے باقاعدہ سازشی ذہن کام کر رہے تھے جو سیاسی مقاصد کی خاطر اہلِ بیتِ اطہارؑ کو راستے سے ہٹانا چاہتے تھے، لیکن یہ اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو محض اُن جیسے ہی ایک انسان تھے جو اپنا کام کر کے رخصت ہو گئے ، دین اسلام لوگوں تک پہنچ چکا ہے لہٰذا اب ہر فرد اللہ تعالیٰ سے بغیر کسی واسطہ یا وسیلہ کے براہ راست تعلق پیدا کر سکتا ہے، ان لوگوں نے اس عقیدے کو گھڑتے ہوئے قرآنِ مجید میں موجود حکم خدا کی بھی کھلی نفی کی :

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيـنَ آمَـنُـوا اتَّقُوا اللّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوا فِيْ سَبِيْلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُون

ترجمہ: اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور تلاش کرو اس تک (پہنچنے کا) وسیلہ اور جہاد کرو اس کی راہ میں تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (۱)

رفتہ رفتہ اس رجحان نے زور پکڑا اور اُن بنیادی ارکانِ اسلام سے لوگوں کا ایمان کمزور ہوتا چلا گیا جن پر ایمانِ کامل رکھنا ایک مسلمان پر لازم ہے، کتاب اللہ کی کھلی نافرمانی کرتے ہوئے جو چیز نبوت کے بعد ان ذہنوں کی زد میں آئی وہ اسلام کا نظریہ توحید تھا روحانیت ایک تحریک بن کر اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئی، یونانی فلسفہ کا مسلمان مفکرین اور فلاسفہ نے دھڑا دھڑ عربی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا اور اسلامی نظریات وعقائد کا حل اغیار کی لادین فکری قلابازیوں کی روشنی میں تلاش کیا جانے لگا، اسلامی نظریات واحکامت کا یونانی فلسفہ سے اختلاط شروع ہوگیا اور نئی تشریحات ونظریات جنم لینے لگے جنہیں ایسے انداز وتسلسل سے پیش کیا گیا کہ اسلام کے بنیادی تصورات سے متصادم ہونے کے باوجود عوام الناس کی ایک بڑی اکثریت اُن کی قائل ہوتی چلی گئی، انہی نظریاتی قلابازیوں نے روحانیت کو ایک باقاعدہ ادارے کے طور پر ترویج دی اور اس کو تصوّف کے نام سے موسوم کیا جانے لگا، تصوّف اور غیر اقوام میں پائی جانے والی روحانیت میں صرف معمولی سا ہی فرق آیا، مراقبہ اور ارتقاذ توجہ کے لئے جو عملیات و طریقہ کار غیر مسلمانوں کے تھے اُنھیں اسلامی عبادات کی آمیزش سے نئے رنگ وڈھنگ سے تصوّف میں پیش کیا گیا حالانکہ دونوں کے مقصد میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، موجودہ زمانے میں ہر مذہب وملت کے افراد زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کی

ا۔المائدہ: ۵:۳۵)

پیچیدہ مذہبی اور غیر مذہبی تشریحات کا شکار ہیں، لوگوں کا ایک گروہ روحانیت کو مذہب کا حصّہ نہیں مانتا، دوسرا گروہ اس کو مذہب کا حصّہ تو مانتا ہے مگر اسے چند مخصوص افراد تک ہی محدود سمجھتا ہے، یہ پیر و مرشد، بابے، اور گیانی ہی روحانیت کے میدان میں راہ نمائی کا واحد ذریعہ مانے جاتے ہیں اور ان کی مریدی اور توسط سے ہی عوام الناس اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں میں روحانیت کو تصوّف اور طریقت کے ناموں سے پکارا جاتا ہے، اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں روحانیت نے بدلتے زمانوں کے ساتھ نت نئے رُوپ اختیار کئے، کہیں گوتم بدُھ معاشرے کی حدّوں سے بھاگ کر جنگلوں میں بسیرا کرتا ہے اور جسم و جان کی کٹھنائیوں اور مراقباتی ریاضت سے گیان حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہوئے دُنیا داروں میں مہاتمہ ٹھہرتا ہے تو کہیں یوگا، ارتکازِ توجہ اور اسی طرح کے دیگر افعال سے انسانی جسم و ذہن کی مخفی طاقتوں پر عبور کو روحانیت کا نام دیا جاتا ہے، تاہم آج کی اس تیز رفتار دُنیا میں تھکن سے چُور انسان روزمرہ کی مشکلات اور فکر و اندوہ سے فرار کے لئے فقط ایک نام نہاد منزلِ کیف و سرور کے حصول کو ہی عمومی طور پر روحانیت سمجھتا ہے، بعض مسلمان بھی بھنگ کا پیالہ یا چرس کا کش لگا کر نعرہ فقیری بلند کرتے ہیں، ان نام نہاد روحانی طبقات میں بہت سی قدریں اور منیشیات اور موسیقی کا استعمال عام اور مشترک ہے لہٰذا نتائج بھی معمولی تغیر کے ساتھ تقریباً ملتے جلتے ہیں، ایسے لوگ درحقیقت روحانیت کے نام پر اپنے ظاہری اور باطنی وجود (inerself) کے تضادات سے وقتی چھٹکارہ پاتے ہیں اور محض بے شعوری کیفیت سے لطف اندوز ہونے کے لئے کٹھن مراحل و مشقتوں سے گزرتے ہیں۔

بحرحال حقیقت یہ ہے کہ روحانیت ایک قدیم تحریک ہے جس میں بے شمار نظریات، مختلف النوح ریاضتی اعمال، اور طریقتیں ہیں، اس تحریک کے ماننے والے ہر مذہب و ملت

میں ہیں اوران کی ایک واضح اکثریت اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو خالقِ اور مابعدالطبعیاتی مخلوقات تک رسائی چاہتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کیا ہیں ، اس جدو جہد میں مصروف افراد نے اپنے نظریات اور تجربات کے ڈھیر لگائے ،خصوصاً ہندوں اوراہلِ یونان نے اسلام سے صدیوں پہلے روحانیات کے مختلف موضوعات بشمولِ فلسفہ وحدت الوجود کے اور کئی طرح کے عملیات اور ریاضتی مشکوں کے انبار لگارکھے تھے،اس سلسلہ کی سب سے بڑی مثال گوتم بدھ ہے جس نے اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول کر کے اور جنگلوں اور ویرانوں میں مسلسل مراقبہ کے ذریعہ گیان حاصل کیا، یہ گیان کیا تھا؟ کیا وہ اُس حقیقت تک پہنچ پایا جس کی اُسے تلاش تھی؟ ان سوالات کا جواب ایک متنازعہ معاملہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنِ کی بعض مخفی طاقتوں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ضرور ہوا تھا، علاوہ ازیں اُس نے بہت سے انسانوں کو متاثر کیا جو اُس کے نظریات کے پیروکار بنے، اسی طرح یونانی فلاسُفہ نے بھی اپنی تحریروں اور نظریات سے ایک عالم کو گرویدہ بنایا چونکہ یونانی فلاسُفہ کے نظریات گوتم بدھ کے برعکس کسی مذہب کو جنم نہیں دے سکے اس لئے ان کو مختلف مذاہب کے لوگوں بلخصوص مسلمانوں نے اختیار کرنے میں کوئی مذائقہ نہ سمجھا۔

مسلمانوں کی اکثریت قرآن کی تفسیر بالرائے کی قائل ہے،قرآنی آیات کے مطالب کو اپنی مرضی سے اخذ کیا جاتا ہے چنانچہ تصوّف کو بھی قرآن، احادیث اور دوسری اسلامی روایات کے حوالہ سے ثابت کیا جاتا ہے اس کے باوجود بعض دانشور اور علماء اسلامی نظریہ تصوّف پر یونانی، بدھ مت، ہندومت، اور عیسائیت کے فلسفہ، اوران کے روحانی رجحانات کے اثرات کو رد نہیں کرتے، ڈاکٹر احمد احمدی اپنی کتاب میں دیگر مذاہب کے تصوّف پر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

''ان ہی اثرات کے تحت ایک مربوط فلسفہِ تصوّف کا ظہور ہوا جس کی بنیاد میں روحانی حقیقت کا انکشاف، تصور، مشاہدہ، عشق اور وجّد جیسے تخیلات ہیں... تصوف نہ تو ایک مخصوص مذہب ہے اور نہ ہی ایک ایسا نظامِ فکر کہ جسے دوسرے تمام [مذاہب کے] نظاماتِ فکر سے الگ کیا جاسکے.'' (۱)

اسلام کے ابتدائی دور میں تصوّف کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی پوری توجہ علم کے حصول اور شریعت کی ترویج وتبلیغ پر تھا، تصوّف بعد میں متعارف ہوئی، یہ حقیقتاً اپنے اندر بہت ساری رہبانیت کی خصوصیات اور ترکِ علائق سموئے ہوئے ہے جنہیں طہارتِ نفس اور دُرستگیِ اعمال کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، مذاہبِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ زمانہ قدیم میں انسان مخالفین کے ڈر سے یا سکون ویکسوئی کے لئے جنگلوں اور غاروں میں جاکر عبادت کرتا تھا، یہ عمل بعد میں رواج پکڑتا گیا اور کئی مذاہب میں نمایاں عنصر کے طور پر غلبہ حاصل کر گیا، اسلام نے رہبانیت کی مکمل طور پر نفی کی ہے اور اس کے کسی بھی عمل کو تسلیم نہیں کرتا، نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ اسلام کے ایک خطبہ میں ذکر ہے کہ آپؑ بصرہ میں اپنے ایک صحابی علا ابن زیاد حارثی کے ہاں عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو اُنھوں نے اپنے بھائی عاصم ابن زیاد کے متعلق شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے بالوں کی چادر اوڑھ لی ہے اور دُنیا سے بالکل بے لگاو ہو گیا ہے یہ سن کر حضرتؑ نے عاصم سے کہا:

''اے اپنی جان کے دشمن تمہیں شیطان خبیث نے بھٹکا دیا ہے، تمہیں

۱۔عرفان وتصوف، باب اول صفحہ۱۲ از ڈاکٹر احمد احمدی

اپنے آل اولاد پر ترس نہیں آتا؟ اور کیا تم نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے جن چیزوں کو تمہارے لئے حلال کیا ہے، اگر تم انہیں کھاؤ برتو گے تو اُسے ناگوار گزرے گا، تم اللہ کی نظروں میں اس سے کہیں زیادہ گرے ہوئے ہو کہ وہ تمہارے لئے یہ چاہے اس نے کہا کہ یا امیر المومنینؑ آپ کا پہناوا بھی تو موٹا چھوٹا اور کھانا رُوکھا سوکھا ہوتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ تم پر حیف ہے، میں تمہارے مانند نہیں ہوں، خُدا نے آیمہ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تا کہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ وتاب نہ کھائے۔'' (۱)

اس خطبہ کی شرع میں مولانا سید نجم الحسن کراروی مرحوم لکھتے ہیں:

''وہ افراد جو جامۂ تصوّف پہن کر زہد و بے تعلّقیِ دُنیا اور رُوحانی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں وہ اسلام کی عملی راہ سے الگ اور اُس کی حکیمانہ تعلیم سے ناآشنا ہیں اور صرف شیطان کے بہکانے سے خودساختہ سہاروں پر بھروسہ کر کے ضلالت کے راستے پر گامزن ہیں۔ چنانچہ ان کی گمراہی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے پیشواؤں کو اس سطح پر سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا اُن کی آواز خدا کی آواز اور اُن کا عمل خدا کا عمل ہے اور شرعی حدود و قیود سے اپنے کو آزاد سمجھتے ہوئے ہر امرِ قبیح کو اپنے لئے جائز قرار دے لیتے ہیں۔ اس الحاد و بے دینی کو تصوّف کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اور اس کے غیر شرعی اصولوں کو

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۰۷ ترجمہ مولانا سید نجم الحسن کراروی مرحوم

طریقت کے نام سے پکارا جاتا ہے اور یہ مسلک اختیار کرنے والے صُوفی کہے جاتے ہیں، سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی وشامی نے یہ لقب اختیار کیا کہ جو اموی النسب اور جبری العقیدہ تھا، اُسے اس لقب سے پکارے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے زہدوتقویٰ کی نمائش کے لئے صوف کا لباس پہن رکھا تھا، بعد میں اس لقب نے عمومیت حاصل کر لی اوراس کی وجہ تسمیّہ میں مختلف توجیہات گڑھ لی گئیں چنانچہ ایک توجیہہ یہ ہے کہ صوف کے تین حرف ہیں ص، و، اور ف۔ صاد سے مراد صبر، صدق سے صفا ہے اور واؤ سے مراد ورد اور وفا ہے، اور فا سے مراد فرد، فقر اور فنا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ صفّہ سے ماخوذ ہے اور صفّہ مسجدِ نبوی کے قریب ایک چبوترا تھا، جس پر کھجور کی شاخوں کی چھت پڑی ہوئی تھی جس میں رہنے والے اصحاب صفہ کہلاتے تھے اور غربت و بیچارگی کی وجہ سے وہیں پڑے رہتے تھے، تیسرا قول یہ ہے کہ عرب کے ایک قبیلہ کے جدِ اعلیٰ کا نام صوفہ تھا اور یہ قبیلہ خانہ کعبہ اور حجاج کی خدمت کے فرائض سرانجام دیتا تھا اوراس قبیلہ کی نسبت سے یہ لوگ صوفی کہے جاتے ہیں۔'' (۱)

سیاستِ سقیفہ اور خاندانِ بنی اُمیہ کی یورشوں، فرضی احادیث سازی اور قرآنی آیات کی خودساختہ تشریح وتفسیر نے دین اسلام کو پہلے ہی ایک شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، اسی نسل سے متعلق ابو ہاشم نے جواختراع گھڑی اُس نے عوام الناس کو ایک نئی گمراہی میں مبتلا کر دیا، اس گمراہی کے راستہ کا آغاز حقیقتاً بغض نبی وعلی اور بغضِ آل رسولؐ سے شروع ہوتا

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۰۷ شرع از مولانا سید نجم الحسن کراروی

ہے، مسعودی کی ایک روایت ہے کہ بنی اُمیّہ کے عہد میں عام لوگوں کے اخلاق میں یہ بات داخل ہوگئی تھی کہ سیّد کو سردار نہ بنائیں، لوگوں کو خاندانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علم لینے کی ہدائیت تھی مگر اُنہوں نے منُہ پھیرلیا اور جہاں سے لینے کا حکم نہ تھا وہاں سے علم لیا اس کا نتیجہ جہالت اور گمراہی کی صورت میں نکلا، جن لوگوں کو راہنما بنایا گیا اُنہیں دین سے کوئی نسبت ہی نہ تھی، اس مقصد کے لئے راستہ ہموار کرنے کے لئے قرآن کریم کی آیات کی شرح و بیان میں لوگوں نے اپنی خواہشات سے کام لیا اور احکاماتِ دین کو اپنی آراؤں سے آلودہ کردیا۔

تصوّف یا روحانیت کے موجودہ تصور پر گفتگو سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان کی ماہیت پر غور کیا جائے اور اس کے اجزائے ترکیبی پر ایک نظر ڈال لی جائے، میرے نزدیک تصوّف نتیجہ ہے انسان کا خود اپنے سے ہی بے خبری اور لاعلمی کا، مناسب غور وفکر سے یہ بات سمجھ میں آجانا چاہے کہ انسان مادیت اور روحانیت کے ایک حسین امتزاج کا نام ہے، ان دونوں خصوصیات میں ایک مناسب توازن ایک بھرپور زندگی کی ضمانت ہے جس پر آج کے جدید علوم بڑی شد و مد سے اسرار کرتے ہیں، انسان کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی ایک خصوصیت کو کمزور یا ترک کرنے کی کوشش کرے، اس بات کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر فقط روح ہی بچے تو انسان اس دُنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہتا اور اگر صرف مادی جسم پر ہی انحصار رہے تو وہ دُنیا کے اس پست ترین مقام سے بلند نہیں ہوسکتا، ہمارا المیہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی حیات کو ایک ہی نوع کا سمجھ لیا گیا ہے، یہ ہی مغالطہ دراصل سارے فساد کی جڑ ہے، مسلمانوں کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک متوازن ترتیب وتقویم پر خلق کیا ہے اور یہ ایسی تقویم ہے کہ جس پر دیگر کسی مخلوق کو خلق نہیں کیا گیا، لیکن اس کے باوجود انسانی اور حیوانی زندگی کو ایک ہی نوع کا سمجھا جاتا ہے یہ بھی فرض کرلیا گیا ہے کہ انسان اور حیوان دونوں کے اجسام کو

زندہ و متحرک رکھنے والی شے روح ہے، ایک رٹا رٹایا ہوا جملہ اکثر سننے کو ملتا ہے کہ یہ زندہ تو ایک ہی طرح سے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور دے کر افضلیت دے دی ہے، میں نے ایک دفعہ متحدہ عرب امارات کے شہر العین میں بھارت سے آئے ہوئے مولانا شمشاد احمد رضوی سے ایک نجی محفل میں یہ سوال کیا کہ روح کیا ہے اور یہ انسان میں کیوں پائی جاتی ہے؟ کیا روح کے بغیر بھی زندگی قائم رہ سکتی ہے؟ سوال کیا کرنا تھا کہ قریب ہی بیٹھے ہوئے بھارت ہی سے تعلق رکھنے والے ایک سیّد زادے نے مولانا صاحب کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور تقریباً تیس پینتیس منٹ کا ایک بے سر و پا لیکچر جھاڑنے سے پہلے یہ کہنے سے بھی گریز نہ کیا کہ آج کے بعد آپ کبھی گمراہ نہ ہوں گے، اُن کا یہ دعویٰ ایک حد تک ٹھیک ہی نکلا، میں اُنھیں بڑی مذہبی اور علمی شخصیت سمجھنے کی گمراہی میں مبتلا تھا جو اُنھوں نے خود ہی دور کر دی، بحر حال اُن کی علمی و فکری قابلیت ایک بے بنیاد مگر عمومی دعویٰ علم سے آگے نظر نہ آئی، اس تزکرہ کی وجہ یہ ہے کہ میں جو نظریہ ان سطور میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں بہت ممکن ہے کہ وہ قارین کو ایک لمحے کے لئے جنجھوڑے ڈالے مگر میرے نزدیک یہ ہی حقیقت ہے جسے کھلے دل و دماغ سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اختصار کے ساتھ عرض ہے کہ انسان اور حیوان کی جان میں بہت ہی بنیادی نوعیت کا فرق ہے اور ان دونوں کی نوع ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہے، مزید یہ کہ روح صرف اور صرف انسان کا خاصہ ہے اس کے علاوہ کسی بھی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کی گئی، حیوان فقط نفسِ حیوانیہ کی بدولت زندہ ہے اور انسانی حیات اُس حالت کا نام ہے جس میں مادی جسم اور روح اکھٹا ہیں، یہ ایک دقیق بحث ہے لیکن تفصیل سے پہلے چند اہم نکات پر توجُھات مرکوز رکھنے کی درخواست ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق سے قبل مادی اور غیر مادی دونوں طرح کی مخلوق پیدا کی، غیر مادی مخلوق میں فرشتے ہیں اور مادی مخلوق میں حیوانات، جمادات، اور نباتات ہیں،

انسان وہ واحد مخلوق ہے جس میں مادی اور غیر مادی دونوں خواص اکھٹے کئے گئے ہیں، یہ بات بظاہر عجیب سی لگتی ہے کہ زندگی اور روح دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن غلط العام نظریات لوگوں میں اس قدر راسخ ہو چکے ہیں کہ زندگی کو روح سے مشروط کیا جاتا ہے، اس نظریہ کی بنیاد میں یہ غلط فہمی ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے انسان کی روح قبض کرتے ہیں تو انسان کو موت آجاتی ہے اسی نسبت سے اُنہیں موت کا فرشتہ بھی کہا جاتا ہے، لہٰذا یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ انسان کے مٹی سے بنے جسم میں حرکت جو کہ زندگی کی ایک علامت ہے فقط روح کی ہی مرہونِ منت ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے بزبانِ قرآن انسانی نفس موت کا ذائقہ چکھتا ہے جس سے وہ خصوصی حالت جو جسم اور روح کو اکھٹے رکھے ہوئے تھی ختم ہو جاتی ہے، چنانچہ انسانی موت جسم، روح، اور نفس کی جُدائی کا نام ہے، نفس کو موت آجاتی ہے اور روح کو حضرت عزرائیل علیہ السلام قبضہ میں لے کر اُس مقام پر پہنچاتے ہیں جسے عالم برزخ کہا جاتا ہے، اللہ کا یہ عظیم المرتبت فرشہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی ذمہ داری پر متعین نہیں بلکہ ایسا سمجھنا غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں، جہاں تک زندگی کا تعلق ہے یہ روح کے بغیر بھی قائم ہے اور قائم رہ سکتی ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہمارے اردگرد موجود ہیں، آج تک دُنیا میں جانوروں، نباتات، اور جمادات میں روح کا کوئی بھی عقلی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکا ہے مگر نظامِ کائنات میں یہ تمام چیزیں زندہ ہیں، جانوروں کے متعلق فقط یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اُن میں روح ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت یا دلیل نہیں دی جاتی، قرآنِ مجید میں سوائے انسان کے کسی اور مخلوق میں روح پھونکے جانے کا ذکر نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب میں کئی سورتوں کے نام جانوروں کے نام پر ہیں مثلاً سورۃ بقرہ، سورۃ فیل، اور سورۃ عنکبوت وغیرہ، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ کائنات کا زرہ زرہ اُس کی حمد و ثنا کر رہا ہے یعنی نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ اپنے خالق کا ذکر عین اُسی کی منشا

کے مطابق کرنے کے وجہ سے مسلمان بھی ہے لیکن انسان اس کا ادراک نہیں رکھتا، بعض مثالیں ایسی ہیں جو ایسے بہت سارے اجسام میں زندگی کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں، ایسے پودے بھی اس دُنیا میں پائے جاتے ہیں جن کو اگر انسان یا جانور چھولے تو وہ اپنے پتے یا پھول بند کر لیتے ہیں، افریقہ اور برازیل کے ایمزون جنگل میں ایسے پودے ہیں جو کیڑے مکوڑوں کا شکار کر کے اپنی نشو ونما کرتے ہیں ان پودوں میں حرکت اور حشرات الارض کا شکار کرنا زندگی کا واضح ثبوت ہے، جدید سائنس بھی نباتات کو زندہ قرار دیتی ہے لیکن اُن میں روح کی موجودگی کے متعلق خاموش ہے لہٰذا یہ امر اس بات پر دلیل ہے کہ جب کوئی دلیل ہی موجود نہیں تو فقط مفروضہ کی بنیاد پر کسی شے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا چنانچہ نہ صرف یہ کہنا بجا ہے کہ زندگی روح کے بغیر بھی قائم ہے بلکہ فقط روح کو زندگی کی علت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، جولائی ۲۰۰۵ء میں اے آر وائی (ARY) ٹیلیویژن کے ایک پروگرام نیوز اینڈ ویوز (News and View) میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک دوسرے شریکِ مذاکرہ ڈاکٹر مہدی حسن کے اس نظریہ کی تائید کی کہ انسان اس دُنیا میں ساٹھ لاکھ سال سے موجود ہے، اس پر اضافہ کرتے ہوئے اُنہوں نے یہ کہا کہ حضرت آدمؑ تقریباً دس ہزار سال پہلے آئے، زمین پر جو انسان پہلے سے موجود تھا اُس میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو منتخب کیا اور اُس میں روح پھونک کر اُسے آدم قرار دیا، یہاں ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ حضرت آدمؑ سے پہلے زمین پر انسان کی موجودگی کو تسلیم کیا بلکہ اُنھیں روح کے بغیر بھی زندہ قرار دیا، اُنہوں نے یہ ضرور کہا کہ حضرت آدمؑ سے قبل پائے جانے والی قدیم مخلوق انسان تو تھی مگر آدمی نہ تھی کیونکہ آدمی صرف آدم کی ہی اولاد ہیں، لیکن یہ بیان نہ کیا کہ جو انسان لاکھوں سال سے کرۂ ارض پر موجود تھا اور جس کی نسل آگے چلتی رہی ہے وہ یکا یک آدم کی آمد کے بعد کہا غائب ہو گیا، علاوہ ازیں مولانا نے آدم کی تخلیق سے متعلق قرآن کے بیان سے بھی عملاً انکار

کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مٹی منگوا کر آدم کا پُتلا بنایا۔

انسان کی ماہیت روح سے متعلق انکشافات کا سنگِ میل ہے، قرآنِ مجید نے یہ طے کر دیا ہے کہ انسان کی خلقت میں تین بنیادی اجزاء ہیں

سُبحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنفُسِھِمْ وَمِمَّا لَایَعْلَمُوْنَ. (۱)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو زمین سے اُگنے والی چیزوں سے پیدا کیا اور دوسرا ان کے نفسوں سے اور تیسرا اس چیز سے پیدا کیا جس کو وہ نہیں جانتے.

یہ آیتِ کریمہ مسلمان کے لئے انسان کی ماہیت پر حجت ہے، زمین سے اُگنے والی چیزوں کے نامیاتی جوہر سے انسان کا جسم بنتا اور بڑھتا ہے، جزوِ ثانی نفس ہے اور جس شے کو انسان نہیں جانتا وہ روح ہے، اس ترکیب سے انسان کا ایک پہلو مادی ہے اور دوسرا روحانی اور ان دونوں کو باہم ملانے والی درمیانی چیز ہے نفس، اپنی اس انوکھی (unique) ہیت کے اعتبار و خلقت سے انسان ایک ایسی مشین کی حیثیت رکھتا ہے جو مادی حالتوں سے غیر مادی حالتوں کا اور غیر مادی حالتوں سے مادی حالتوں کا ادراک کرتا ہے۔

روح اگرچہ جُزوِ انسان ہے مگر اس کے بارے میں انسانی علم انتہائی محدود ہے موجودہ زمانے میں جدید سائنس اور سائنسدان باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے اس عظیم اسرار کو نہیں سمجھ سکے، نتیجتاً یا تو اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے یا پھر عجیب و غریب

۱۔سورۃ یٰسین: ۳۶:۲۳

توجیہات پیش کی جاتی ہیں اسی طرح کی ایک عجیب حکایت کو بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ روح پر تحقیق کرنے والے بعض سائنسدانوں نے ایک قریب المرگ شخص کو شیشے کے ایک مکمل طور پر بند بکس میں رکھ دیا، وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اگر روح ایک حقیقت ہے اور انسان کے مرنے کے بعد جسم سے پرواز کر جاتی ہے تو وہ اس بند بکس سے کس طرح باہر نکلے گی، جب اُس شخص کا انتقال ہوا تو بیان کیا جاتا ہے کہ شیشے کا وہ بکس ٹوٹ گیا اور سائنسدانوں نے یہ رائے قائم کی کہ روح ایک حقیقت ہے اور وہ ہی بکس کو توڑ کر باہر نکلی ہے، اس سراسر غلط حکایت کو بیشتر مسلمان دانشوروں اور عوام الناس کے منہ سے میں نے سنا ہے، لیکن میرے نزدیک اس میں کوئی صداقت نہیں، روح ایک لطیف شے ہے جس کی تخلیق میں مادے کا کوئی عمل دخل نہیں لیکن اس کے برعکس روشنی ایک مادی شے ہے، جدید سائنس ایک عرصہ سے یہ ثابت کر چکی ہے کہ روشنی انتہائی باریک زروں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں طبعیات (Physics) کی زبان میں فوٹان (Photan) کہا جاتا ہے، یہ بالکل اسی طرح ہیں جیسے جمادات کا سب سے باریک اور ابتدائی زرہ ایٹم کہلاتا ہے، اسی طرح شیشہ ایک مادی یا کثیف شے ہے مگر روشنی کے ذرات اُس میں سے بغیر کسی رکاوٹ کے آر پار گزر سکتے ہیں اور شیشہ نہیں ٹوٹتا، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ روح جیسی ایک لطیف شے شیشے سے گزرے اور وہ ٹوٹ جائے، لہٰذا یہ محض ایک فرضی حکایت ہے جسے نہ معلوم کس غرض سے گھڑا گیا ہے۔

روح کے بارے میں اسلام سے پہلے بھی ہندو، یونانی اور دیگر تہذیبوں اور مذاہب کے فلاسفہ اور دانشوروں نے اپنی رائے زنی کی ہے لیکن وہ ابھی تک اس راز کی حقیقت نہیں جان سکے، ایک مسلمان اسکالر روح کو کائنات کا سب سے بڑا اسرار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسرار کائنات میں سے روح سب سے بڑا راز ہے، جس کے

ادراک سے انسانی عقل ہمیشہ قاصر رہی، انبیاء علیہم اسلام بھی صرف
اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے کہ روح امرِ الٰہی ہے۔'' (۱)

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے جن سے روح کے بارے میں لوگ سوالات کرتے تھے، ان سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے جواب ارسال فرمایا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجئے کہ روح میرے اللہ کے امر سے ہے، اوراس کے ساتھ ہی یہ آگاہی بھی دے دی کہ انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے گویا کہ یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس کی حقیقت کو انسان تھوڑے علم کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا، آیتِ قرآن ہے،

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ
اِلَّا قَلِیْلًا ۔ (۲)
ترجمہ: (آپؐ) کہہ دیں کہ روح میرے رب کے امر سے ہے اور تم
(انسان) کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہ آیتِ قرآنی چند نہایت اہم نکات آشکار کرتی ہے، ایک یہ کہ علم بنیادی شے ہے روح کو سمجھنے کے لئے، دوسرے یہ کہ انسان کو تھوڑا علم دیا گیا ہے چنانچہ اس کے ذریعے وہ روح کی حقیقت کو نہیں جان سکتا، ان نکات کی روشنی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روح کی حقیقت کو فقط صاحبانِ علم ہی جانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صرف اتنا کہنا کہ

۱۔ من کی دُنیا، صفحہ ۱۴ از ڈاکٹر غلام جیلانی برق
۲۔ سورۃ بنی اسرآئیل: ۱۵:۸۴

روح اللہ تعالیٰ کے امر سے ہے اس بات کی دلیل ہے کہ دُنیا کے تمام انسان اس کی ماہیت کو اپنے محدود علم کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتے، آیتِ مبارکہ میں علم پر زور دیا گیا ہے لہٰذا روح کو سمجھنے کے لئے اُن افراد سے رجوع ضروری ہے جن کو اللہ رب العزت نے علمِ لدنی عطا کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحبانِ علم کے سردار و آقا ہیں اور حبیبِ خُدا کی علمی معراج کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، آیتِ قرآنی ہے

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىO إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى (۱)

ترجمہ: اور وہ (نبیؐ) اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بولتے ہی نہیں. یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے.

اللہ تعالیٰ زبانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکلنے والے ہر لفظ کو خود سے منسوب کر رہا ہے، جب یہ ہی شخصیت خود کو علم کا مدینہ کہتی ہے تو یہ مانے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ علم والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، غور طلب بات یہ ہے کہ اس حدیثِ پاک میں لفظِ شہر کو بطورِ استعارہ استعمال کیا گیا ہے جو کہ معاشرت کے اعتبار سے ایک مکمل اکائی کی عکاسی کرتا ہے، جب علم کی نسبت سے اس کے معانی دیکھے جایں گے تو مکمل علم کہا جائے گا، یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے اور اُس کا علم علمِ ذاتی ہے جسے علمِ الٰہی بھی کہا جاتا ہے، مخلوق کے پاس اُس کا عطا کردہ یعنی علم خلق ہے، سید علی عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں

۱۔ سورۃ النجم ۳۔۴ :۵۳

''علمِ الٰہی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور صفت الٰہی ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے.....اور علم من اللہ وہ علمِ شریعت حقہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہم مکلّف بالاحکام بنائے گئے اور وہ فرمانِ حق ہے جو زبانِ انبیاء سے ہم کو پہنچا'' (۱)

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف علم باللہ کے حامل تھے اور عرفانِ حق کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز تھے بلکہ علم من اللہ کے شارح بھی تھے، رہا یہ سوال کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روح کی حقیقت کا علم تھا؟ تو اس کا جواب اُن کے پروردہ حضرت علی علیہ اسلام نے روح کی پانچ اقسام بیان کر کے دے دیا ہے، حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کوئی بھی ایسی شخصیت نہ تھی جو علم کی اُس معراج پر فائز تھی جس کا اعلان زبانِ نبوت نے خود کیا، متفقہ علیہ حدیث ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو علم کے مدینہ کا دروازہ کہہ کر پکارا ہے، علی عثمان ہجویری نے زبانِ رسول سے نکلنے والے الفاظ کو علم من اللہ قرار دیتے ہوئے نہ صرف فرمانِ حق لکھا ہے بلکہ شریعت حقہ بھی کہا ہے، چنانچہ رسولِ خُدا کے بعد علم کا اعلیٰ ترین مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کا ہے اور وہ روح کی حقیقت سے واقف تھے کیونکہ کسی شے کی ماہیت جانے بغیر اُس کو اقسام میں نہیں بانٹا جا سکتا، جب حضرت علی علیہ السلام کو روح کی ماہیت کا علم تھا تو اُن کے اُستادِ محترم سے کیوں کر پوشیدہ ہو سکتی ہے، رسولؐ اللہ کے جواب میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو کہا گیا ہے کہ اگر وہ روح کے متعلق جاننا چاہتے ہیں تو اہل بیت اطہار سے تمسک رکھیں کیونکہ وہ ہی آپؐ کے بعد علم الٰہی کے وارث اور شارح ہیں۔

۱۔ کشف المحجوب، صفحہ ۹۵۔۹۶ از سید علی عثمان ھجویری، مترجم محمد احمد قادری

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ اسلام نے روح کی جو پانچ اقسام بیان کی ہیں وہ یہ ہیں

۱۔ روح القدس

۲۔ روح الایمان

۳۔ روحِ القوت

۴۔ روحِ شہوت

۵۔ روح البدن

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے:

''انبیاءؑ کے لئے جو گروہِ سابقین ہیں پانچ روحیں ہیں...انبیاء روح قدس کے ساتھ مبعوث کئے گئے اور انہوں نے اسی کے سبب اشیاء کو معلوم کیا اور روح ایمان کے سبب خدا کی عبادت کی اور کسی کو اس کا شریک نہیں گردانا اور روح القوت کے سبب اپنے دشمنوں سے جہاد کیا اور معاش کی تدبیر کی اور روح شہوت کے سبب لذت طعام حاصل کی اور جوان عورتوں سے نکاح حلال کیا اور روح بدن کے سبب چلتے پھرتے ہیں...آخری چار روحیں مومنین کے لئے ہیں...اور آخری تین روحیں کفار کے لئے ہیں...'' (۱)

۱۔ نہج الاسرار کلام حیدر کرار، جلد اول صفحہ ۴۶ مولف محمد بشارت علی و مولوی سید غلام رضا، رحمت اللہ بک ایجنسی، کھارادر، کراچی

اس بیان اور انسانی زندگی کے ارتقاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ روح انسان کو بتدریج اور انسان کی حیثیت کے مطابق عطا کی جاتی ہے، امیرالمومنینؑ نے انسانوں کے تین گروہ یا طبقے بیان فرمائے ہیں یعنی انبیاء، مومنین، اور کفار، اسی طرح جو اقسامِ روح بیان کی گئی ہیں وہ درحقیت اُس شے کو کہ جسے مجموعی طور پر روح کے لفظ سے پکارا گیا ہے کی خصوصیات ہیں، انسان میں اس کی ابتداء روح البدن سے ہوتی ہے اور اُس وقت مکمل ہو جاتی ہے جب ایمان کی خصوصیت اُس میں وارد کی جاتی ہے۔

شکمِ مادر میں جب بچے کا جسم مکمل ہو جاتا ہے تو اُس میں نفسِ حیوانیہ اور روح کے ملاپ سے اللہ تعالیٰ زندگی کے آثار پیدا کرتا ہے، یہ روح صرف ایک خصوصیت رکھتی ہے جس کی بدولت بچے کے نفسِ حیوانیہ کو تقویت ملتی ہے اس مرحلہ پر اس کو روح البدن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، پیدائش کے بعد بچے کی روح کو ایک اور خصوصیت جسے روحِ شہوت کہا گیا ہے دی جاتی ہے، بعض علماء نے اسے روحِ خواہش بھی کہا ہے، یہ روح انسان میں انگنت صلاحیتوں کی داغ بیل ڈالتی ہے جن کا ظہور اور ارتقاء انسانی عمر میں اضافے سے مشتق ہے، بعدازاں انسان کی روح میں ایک اور خصوصیت کا اضافہ ہوتا ہے جسے مولائے کائنات نے روح القوت کہا ہے، یہ انسان میں بہادری، شجاعت، اور بدی کے خلاف ڈٹ جانے کے خواص پیدا کرتی ہے، جب روح میں ایمان کی خصوصیت (روحِ ایمان) داخل ہوتی ہے تو وہ اُس درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے جو کہ ایک بندہ ءمومن کا لازمہ ہے، پانچویں اور آخری روحانی خصوصیت یعنی روح القدس کو اللہ تعالیٰ نے صرف انبیائے کرام کے لئے مخصوص رکھا ہے، امام علی رضا علیہ السلام کے بقول روحِ ایمان مومن کا ساتھ اُس وقت چھوڑ دیتی ہے جب وہ مبتلائے گناہ ہوتا ہے، کفار کے روحانی کمالات بدنی، شہواتی، اور قواتی درجات پر جا کر رُک جاتے ہیں۔

یہ بات قدرے دقیق لیکن وضاحت طلب ہے کہ جانور میں فقط نفسِ حیوانیہ ہے جو اُسے

زندگی فراہم کرتا ہے جس کی بدولت وہ چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا ہے، جب یہ نفسِ حیوانیہ مرتا ہے تو جانور کی جان معدوم ہو جاتی ہے، سادہ لفظوں میں نفسِ حیوانیہ کے مرنے کا نام جانور کی موت ہے، یہ ہی نفسِ حیوانیہ انسان میں بھی ہوتا ہے مگر یہاں اس کی امداد روح البدن سے کر کے وہ پلیٹ فارم مہیا کیا گیا ہے جو مادیت اور روحانیت کے درمیان رابطہ کا پل یا واسطہ بن سکے، انسانی حیات کے علاوہ کل کائنات میں مادہ اور روح دونوں کسی ایک مقام پر اکھٹے نہیں ملتے، یہ دونوں یعنی نفسِ حیوانیہ اور روح البدن انسان کی دُنیاوی زندگی میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، نفس حیوانیہ سے ایک طرف تو انسان مادے سے تعلق جوڑے ہوئے ہے اور دوسری طرف روح کے ذریعے عقل اور مابعد الطبیعاتی اجسام سے رابطہ میں ہے، مثلاً محبت ایک مابعد الطبعاتی یا روحانی جذبہ ہے، یہ مادے میں ہرگز نہیں پایا جا سکتا، علم منطق کی رو سے مادہ اُسی چیز کو اپنے اندر سمو سکتا ہے جو مادی وجود رکھتا ہو، لہٰذا ایک گلاس میں آپ پانی تو ڈال سکتے ہیں مگر محبت نہیں، چنانچہ نفس حیوانیہ انسان کے مادی جسم میں جان پیدا کرتا ہے تو روح البدن اُس میں وہ وسعت پیدا کرتی ہے جو اُس جان کو اشرف المخلوق کے شایانِ شان بناتی ہے، انسانی ہیئت کے اعتبار سے تنہا نفس حیوانیہ ہی جانوروں کی طرح اُس کی زندگی کا بار نہیں اُٹھا سکتا لہٰذا روح البدن اُس کی ممدوح بنتی ہے، ایک عالم دین سید عبداللہ شاہ عبد موسوی انسانی حیات کے متعلق کہتے ہیں

> ''نفس روح اور بدن کے درمیان دونوں کو ملانے اور ملا کر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے کہ اس کے بغیر روح اور بدن نہ تو ایک جگہ اکھٹے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ملکر قائم رہ سکتے ہیں اسی واسطے ہی موت کو نفس کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ نفس کے قبض ہو جانے سے روح اور جسم میں جدائی

ہو جاتی ہے ۔۔۔۔ پس نفس ہی انسانی زندگی کا ذریعہ ہے .اس کی علیحدگی روح وجسم میں جدائی پیدا کر دیتی ہے جس کو موت کہا جاتا ہے۔'' (۱)

نفس حیوانیہ اور روح البدن کے ملاپ سے انسان بیک وقت ایک حیوان بھی ہے اور اعلیٰ وارفع مخلوق بھی، چنانچہ روح کی اقسام میں سے روح البدن براہ راست انسان کی حیات سے منسلک ہے اور یہ ہی انسان اور جانور کی حیات میں وجہ امتیاز بھی، اسی نسبت سے اسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے انسانی بدن کی حیات کہہ کر پکارا ہے، حدیثِ ہے

الرّوحُ حیاة البَدَنِ وَ اَلعقلِ حیاةُ الرّوُح

روح جسم کی حیات ہے اور عقل روح کی حیات (۲)

اس حدیث میں صرف انسانی بدن سے متعلق کلام ہے تمام ابدان اس کے مخاطب نہیں کیونکہ عقل فقط انسانی خاصہ ہے، جانور مر کر فنا ہو جاتے ہیں، انسان کے لئے موت ایک عارضی سکوت ہے خاتمہ نہیں، حیاتِ ابدی میں یہ ہی روح البدن انسان کے جسمِ لطیف کی روحِ حیات ہو گی کیونکہ وہاں مادی جسم نہ ہو گا کہ جس کو متحرک کرنے کے لئے اُسے نفس حیوانیہ کی احتیاج ہو۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے روح اور فرشتوں میں فرق کو بھی واضح کیا ہے اور یہ بتایا

۱۔حرمتِ بناتِ رسول علیٰ غیرِ اولادِ رسول ۔ از سید عبداللہ شاہ عبد موسوی، مکتبہ ایمان، لاہور

۲۔تجلیاتِ حکمت ۔ صفحہ ۳۳۲، از سید اصغر ناظم زادہ قمی، ترجمہ سید قمر عباس، انصاریان پبلیکیشنز، ایران

ہے کہ فرشتے اور روح دو الگ الگ مخلوقات ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے

تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوحُ

ملائکہ اُس شب کو نازل ہوتے ہیں اور روح

علماء کا کہنا ہے کہ اگر روح کا شمار ملائکہ میں ہوتا تو الگ سے اُن کو اس آیہ مبارکہ میں مذکور نہ کیا جاتا، روح کو ملائکہ سے افضل مخلوق بھی قرار دیا گیا ہے نواب مولوی علی جواد خان صاحب اپنی کتاب میں ایک روایت ابن ادریس علیہ الرحمہ کے حوالے سے لکھتے ہیں جس کو وہ ابوبصیر سے نقل کرتے ہیں جو کہ ہمرکاب امام جعفر صادق علیہ السلام تھے:

''میں نے (یعنی ابوبصیر نے) عرض کیا کہ کیا روح جبرئیل امین نہیں؟ فرمایا (امام جعفر صادقؑ نے کہ) روح وہ مخلوق ہے جو جبرئیل سے عظیم تر ہے۔ جبرئیل تو ملائکہ میں سے ہیں اور روح ملائکہ سے عظیم تر مخلوق ہے۔'' (۱)

میں نے اس روایت پر اپنے بساط کے مطابق غور وفکر کیا اور امیر المومنین علیہ السلام کی مندرجہ بالا حدیث الرّوحُ حیاۃ البَدَنِ وَ اَلعقلِ حیاۃُ الرّوح کے حوالے سے دیکھا تو اس کے مطالب واضح ہوئے۔

انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عقل کی نسبت سے ہے کیونکہ یہ حیاتِ روح ہے جہاں یہ ہوگی وہاں روح ہوگی اور جہاں عقل نہ ہوگی وہاں روح نہ ہوگی، لہٰذا جانور تو احاطہ

۱۔ الکاظم جلد اول صفحہ ۱۲۔۱۴ از نواب مولوی علی جواد خاں صاحب، مفیض الانوار، لکھنو

روح سے باہر ہیں ہی مگر فرشتے بھی عقل نہیں رکھتے، اگر وہ حاملِ عقل ہوتے تو اشرف المخلوق ہوتے جو کہ وہ نہیں ہیں علتِ شرف عقل ہے یہ جہاں جائے گی شرف اس کے ساتھ جائے گا، اس کا مسکن روح ہے لہٰذا روح کا فرشتوں سے افضل ہونا لازم ہو جاتا ہے، یہاں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روحانیات اور عقلیت میں نہ تو کوئی فرق ہے اور نہ ہی یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، کوئی بھی عمل جو احاطہ عقل سے باہر ہوگا روحانی نہیں کہلا سکتا کیونکہ روح کی حیات ہی عقل سے منسلک ہے اور اس کے بغیر وہ بے کار شے ہے۔

ایک سوال یہ بھی اُٹھتا ہے کہ عقل اور انسانی دماغ میں کیا رشتہ ہے؟ یہ سوال بہت سارے نکات عیاں کرتا ہے، عقل کا مقام روح ہے دماغ نہیں، لوگوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ عقل اور دماغ ایک ہی شے کے دو نام ہیں یا پھر یہ کہ عقل دماغ میں پائی جاتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، دماغ انسانی جسم کا ایک عضو ہے اور اس کی تعمیر مادہ سے ہے مگر عقل ایک روحانی شے ہے، دماغ میں ایک دوسری قوت پنہاں ہے جسے ذہانت کہتے ہیں اور یہ انسانی حواس کے ذریعے جو سگنل یا پیغامات وصول کرتی ہے اُنھیں دماغ میں منتقل کرتی ہے اور اُن کی بنا پر نہ صرف جسمانی نظام کو ضرورت کے مطابق چلاتی ہے بلکہ عقل کی معاونت بھی کرتی ہے، یہ قوت عقل سے عاری انسان جسے عرفِ عام میں پاگل کہا جاتا ہے اُس میں بھی ہوتی ہے لیکن عقل کی غیر موجودگی اُسے فقط جانوروں کے درجہ میں ہی رکھتی ہیں، ہمارے اردگرد بہت سارے ایسے جانور ہیں جن کی ذہانت انسان کو حیران کر دیتی ہے مثلاً بندر ایک نہایت ہی ذہین جانور ہے۔

اصولاً روحانی شے کے لئے روحانی ظرف کا ہونا لازم ہے چنانچہ علم بھی ایک روحانی شے ہے جو انسانی حواس، ذہانت، اور دماغ کے ذریعے عقل کو منتقل ہوتا ہے اس کا مخزن یا مقام دماغ نہیں بلکہ عقل ہے اس بات کو سمجھنے کے لئے کتاب کی مثال دی جا سکتی ہے، ایک عالم اپنے علم کو الفاظ کی شکل دے کر صفحات پر منتقل کرتا ہے جو باہم یکجا ہو کر کتاب کی

شکل اختیار کرتے ہیں، یہ الفاظ یا کتاب اپنے اندر علم نہیں رکھتی بلکہ یہ مجموعہ ہے اُن اشاروں کا کہ جن کے ذریعے انسانی علم ایک عقل سے دوسری عقل کی طرف منتقل ہوتا ہے، باالفاظِ دیگر دماغ انسانی عقل کی کتاب یا نوٹ بُک ہے جس کی طرف انسانی عقل ضرورت پڑنے پر رجوع کرتی ہے، اس عمل میں ذہانت عقل کی معاونت کرتی ہے۔

انسان اکتسابی علم مادی ذریعہ سے حاصل کرتا ہے مگر اس کی وجہ سے جنم لینے والے تمام خیالات، نظریات، تصورات، اور آگہی غیر مادی حالت میں ہوتی ہے، لیکن جب ان کو انسان استعمال کرتے ہوئے کوئی عمل انجام دیتا ہے تو اُسے اپنی مادی صلاحیتوں اور جسم کو بروِ کار لانا ہوتا ہے، مثلاً میرے پاس اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کی غیر مادی صلاحیت اور علم موجود ہے مگر اس پر عمل کرنے کے لئے مجھے اپنے جسم کے مادی اعضاء اور جسمانی طاقت کا سہارا لینا پڑتا ہے، عمل کی تحریک علم سے بھی ہوتی ہے اور نفس سے بھی، کوئی بھی علم بذاتِ خود برا نہیں، انسان میں برائی کی تحریک نفس سے جنم لیتی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس میں برائی (نفسِ امارہ) اور اچھائی (نفسِ لوامہ) رکھ دی گئی ہے، یہ نفسانی تحریکیں انسانی علم اور صلاحیتوں کو نیکی یا برائی کے لئے استعمال کراتی ہیں، علم و نظریات انسان کی نفسانی تحرکوں کے ساتھ مل کر جس چیز کو سب سے پہلے جنم دیتے ہیں اُن کو نیت کہا جاتا ہے اور یہ تحریکِ علمی یا نفسی کی بنیاد پر درست یا غلط ہوسکتی ہے، یہاں اس کو مثال سے واضح کرنے کی ضرورت ہے، میں نے پہلے سجدہ کرنے کی مثال دی ہے اسی کو لے لیجئے، سجدہ کرنے کا علم اور درست طریقہ اور علم کے ساتھ جب میرا نفس اس تحریک کو ملوث کرتا ہے کہ میں دیگر افراد کو دکھاوں کہ میں نمازی ہوں تو درست انداز سے کیا گیا سجدہ نہ صرف باطل ہوگیا بلکہ مجھے مستحق سزا بنا دیتا ہے، لیکن اگر یہ سجدہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو بجا لانے والا ثواب کا مستحق ٹھرے گا، انسان کے تمام افعال کا دارومدار نیت پر ہی ہوتا ہے اور اسلام اس پر ہی بنیاد رکھ کر نیک اور برے

اعمال کی گروہ بندی کرتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اعملوں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

انسان اور اُس کی ماہیت کو سمجھنے کے بعد آیئے اب تصوّف کا مزید جائزہ لیتے ہیں، تصوّف کی بنیاد سازی میں خواجہ حسن بصری کا بھی بڑا ہاتھ مانا جاتا ہے، اس شخص کے نظریات وعقائد کے بارے میں اہل تشیع اچھی طرح واقف ہیں

''ایک روایت میں ہے کہ جناب امیر المومین علیہ السلام نے حسن بصری سے فرمایا: اے حسن! ہر اُمت میں ایک سامری ہوا کرتا ہے، اور اِس اُمت کا سامری تو ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: اے حسن بصری! خواہ تو دائیں چلا جا یا بائیں، علم کہیں نہ ملے گا سوائے اہل بیتؑ کے۔'' (۱)

مختلف فلاسفہ جن میں امام غزالی اور ابنِ رُشد ایک کلیدی حیثیت رکھتے ہیں نے اپنے نظریات اور فلسفہ سے تصوّف کو نئی جہتیں عطا کیں اور فلسفہ وحدۃ الوجود کی ترویج میں ایک نمایاں کردار ادا کیا، تصوّف میں ایک سلسلے جسے توحیدیہ مجدیہ نقشبندیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کے بانی خواجہ عبدالحکیم انصاری فرماتے ہیں:

''تصوفِ اسلامی میں ایک ایسا عقیدہ ظہور پزیر ہوا جس نے صوفی حضرات کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس عقیدے کو وحدت الوجود

۱۔ روح الحیات (اردو ترجمہ عین الحیوۃ) صفحہ ۶۷۴، از مُلا باقر مجلسی، مترجم مولانا سید علی حسن اختر صاحب امروہوی، محفوظ بک ایجنسی، مارٹن روڈ، کراچی

کہتے ہیں. تصوف کو اس عقیدے سے جناب ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ (۱۱۶۵ء بمطابق ۵۶۰ھ ۔ ۱۲۴۰ء بمطابق ۶۳۸ھ) نے متعارف کرایا تھا. ۔ ۔ ۔ [فتوحاتِ مکیّہ اور فصوص الحکم] انہی کتابوں میں آپ [ابن عربی] نے وحدت الوجود کا مسئلہ تحریر فرمایا تھا اور وہ قرآن کی تعلیم سے ٹکراتا تھا، اس لئے بہت سے علمائے دین مخالف ہو گئے. چنانچہ یہ جب مصر پہنچے تو علمائے کرام نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا. اور سلطانِ مصر نے ان کے قتل کا حکم دے دیا.'' (۱)

''حضرت ابن عربی کے موافق اور مخالف لکھنے والے سینکڑوں ہی تھے لیکن خلاف لکھنے والوں میں امام ابن تیمیہ اور امام ذہبی دو بزرگ ایسے تھے جن کی تحریریں آج بھی بطور سند پیش کی جاتی ہیں لیکن ابن عربی کے قلم اور نگارش و استدلال میں وہ زور تھا کہ اس کے آگے کسی کی پیش نہ گئی اور نظریہ وحدت الوجود کو رفتہ رفتہ تمام اسلامی ممالک کے بہت سے علماء اور شیوخ نے بہ حیثیت ایک عقیدہ کے قبول کر لیا۔ یہاں تک تو خیریت تھی لیکن علماء و شیوخ سے نکل کر بات جب جاہل صوفیوں اور ان کے مریدوں تک پہنچی تو ایک طوفان بپا ہو گیا. جو لوگ پہلے ہی سے شریعت کی پابندیوں اور حدود و قیود سے گریزاں تھے ان کے تو مزے آ گئے۔'' (۲)

۱۔ حقیقۃ وحدۃ الوجود ۔ صفحہ ۱۴۔۱۵، از خواجہ عبدالحکیم انصاری ۔ ترجمہ محمد علی نجیب، دمشق شام

۲۔ ایضاً ۔ صفحہ ۸۔۱۰

یاد رہے کہ یہ وہی امام غزالی ہے جس نے سلجوقیوں کے عہد میں فتویٰ دیا تھا کہ نام لے کر لعنت کرنے میں خرابی ہے اور یزید لعین پر بھی لعنت نام لے کر نہ کی جائے کیونکہ اُس کا قتلِ امام حسین علیہ السلام کرنا یا اس کی اجازت دینا ثابت نہیں جب تک قتل و اجازت کا ثبوت نہ ہو تب تک اس کو قاتل و اجازت دہندہ بھی نہ کہا جائے، اسی شخص نے اہل جمہور کو علیؑ اور اولادِ علیؑ پر تبرا کرنے کا نیا گر سکھایا کہ ایسے کرنے کے لئے شیعان علیؑ کو روافض کہا جائے، چنانچہ ایک آدمی منبر پر جاتا اور صدا لگاتا فلاں ابن فلاں رافضی بود، اس کے جواب میں سارے حاضرینِ محفل بر پدرش لعنت کا نعرہ لگاتے۔

دوسری طرف ابن رُشد اسپین کا رہنے والا تھا اور اپنے دور میں طب اور قانون کا بہت بڑا ماہر تھا، اس کو سرکاری طور پر یونانی فلسفہ کو عربی میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جسے وہ ۳۰ برس تک انجام دیتا رہا لہٰذا اس کے تمام نظریات پر یونانی فلسفہ کی گہری چھاپ تھی جدید فلاسفہ کی ایک بڑی تعداد فلسفہ وحدۃ الوجود کو یونانی حکماء کی اختراع سمجھتے ہیں اور خود اہلِ تصوّف کی ایک بڑی تعداد اسے غیر اسلامی گردانتی ہے، مجدد الف ثانی مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں اسی فلسفہ کے خلاف ایک بڑی تحریک کے بانی تھے اور ان کی زندگی کا ایک بڑا حصّہ اسی کے خلاف جدوجہد میں گزرا، خواجہ عبدالحکیم انصاری مزید لکھتے ہیں:

> ''اکبر نے ویدوں اور اپانشدوں کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کرایا، ان میں وحدت الوجود پہلے ہی سے موجود تھا۔۔۔مجدد الف ثانی نے سب سے زیادہ جدوجہد وحدت الوجود کے خلاف کی کیونکہ ان کی دانست میں یہ عقیدہ ہی تمام خرابیوں کی جڑ تھا'' (۱)

۱۔ حقیقۃ وحدۃ الوجود ۔ صفحہ ۱۸۔۲۳

بڑے بڑے جید صوفیا کرام اور شخصیات جنہیں اولیا اللہ بھی کہا جاتا ہے کو اس نظام کی مرہونِ منت قرار دیا جاتا ہے، اس غلط العام دعویٰ کے رد میں صرف یہ ہی کافی ہے کہ اولیا اللہ کی ایک بڑی تعداد نسب کے اعتبار سے سادات تھی اور انہوں نے کبھی بھی خود کو کسی سلسلہ تصوّف سے منسلک نہیں کیا بلکہ لوگوں نے اولیا کے مزارات پر مجددی، چشتی، قادری، اور نقشبندی وغیرہ کی تختیاں لگوا کر انہیں مخصوص سلسلوں سے متعلق ہونا ظاہر کیا تا کہ اس کے در پردہ وہ اپنے سلسلوں کی تبلیغ و ترویج کر سکیں۔

موجودہ زمانے میں تصوف کے بہت سارے فرقے یا طریقتیں ہیں لیکن مولانا نجم الحسن کراروی نے اس کی سات بنیادی اقسام بیان کی ہیں ہم اُنھیں نہج البلاغہ میں خطبہ نمبر ۲۰۷ کے فٹ نوٹ (حاشیہ) سے من وعن نقل کرتے ہیں:

۱۔ وحدتیہ:

یہ فرقہ وحدۃ الوجود کا قائل ہے، چنانچہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز خُدا ہے یہاں تک کہ ہر نجس و ناپاک چیز کو بھی یہ اسی منزل الوہیّت پر ٹھراتے ہیں اور اللہ کو دریا سے اور مخلوقات کو اس میں اُٹھنے والی لہروں سے تشبیہہ دیتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ دریا کی لہریں دریا کے علاوہ کوئی جُدا گانہ وجود نہیں رکھتیں بلکہ اُن کا وجود بعینہ دریا کا وجود ہے جو کبھی اُبھرتی ہیں اور کبھی دریا کے اندر سمٹ جاتی ہیں، لہٰذا کسی چیز کو اس کی ہستی سے الگ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۲۔ اتحادیہ

اس فرقہ کا خیال یہ ہے کہ وہ اللہ سے اور اللہ اُس سے مُتحد ہو چکا ہے،

یہ اللہ کو آگ سے اور اپنے کو اس لوہے سے تشبیہہ دیتے ہیں کہ جو آگ میں پڑا رہنے کی وجہ سے اُس کی صورت و خاصیّت پیدا کر چکا ہو۔

۳۔ خلولیہ

اُس کا عقیدہ یہ ہے کہ خُداوندِ عالم عارفوں اور کاملوں کے اندر حلول کر جاتا ہے اور ان کا جسم اس کی فرودگاہ ہوتا ہے، اس لئے وہ بظاہر بشر اور بباطن خُدا ہوتے ہیں۔

۴۔ واصلیہ

یہ فرقہ اپنے کو واصل باللہ سمجھتا ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ احکامِ شرع، تکمیلِ نفس و تہذیب اخلاق کا ذریعہ ہیں اور جب نفس حق سے متصل ہو جاتا ہے تو پھر اُسے تکمیل و تہذیب کی احتیاج نہیں رہتی، لہٰذا واصلین کے لئے عبادات و اعمال بیکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ اذا حصلت الحقیقة بطلت الشریعة (جب حقیقت حاصل ہو جاتی ہے تو شریعت بیکار ہو جاتی ہے) لہٰذا وہ جو چاہیں کریں ان پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ زراقیہ

یہ فرقہ نغمہ و سرود کی دُھنوں اور حال و قال کی سرمستیوں کو سرمایہ عبادت سمجھتا ہے اور درویشی و دیوزہ گری سے دُنیا کماتا ہے اور اپنے

پیشواؤں کی من گھڑت کرامتیں سُنا کر عوام کو مرعوب کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

۶۔ عشاقیہ

اس فرقہ کا نظریہ یہ ہے کہ المجازة قنطرة الحقيقة عشق مجازی عشق حقیقی کا ذریعہ ہوتا ہے، لہٰذا عشقِ الٰہی کی منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی مہوش سے عشق کیا جائے لیکن جس عشق کو یہ عشقِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ صرف اختلاج دماغی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے عاشق قلب و رُوح کی پوری توجہ کے ساتھ ایک فرد کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس تک رسائی ہی اس کی منزل آخر ہوتی ہے، یہ عشق فسق و فجور کی راہ پر تو لگا سکتا ہے مگر عشقِ حقیقی کی منزل سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔

۷۔ تلقیہ

اس فرقے کے نزدیک علومِ دینیہ کا پڑھنا اور کتب کا مطالعہ کرنا قطعاً حرام ہے بلکہ جو مرتبہ علمی ستّر برس تک پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا وہ ایک ساعت میں مُرشد کے تصّرفِ روحانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ علمائے شیعہ کے نزدیک یہ تمام فرقے گمراہ اور اسلام سے خارج ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں آئمہ اطہار کے بکثرت ارشادات موجود ہیں۔

تصوف کیا ہے اور اس کے ماننے والے اس سے کیا چاہتے ہیں اس کو خواجہ عبدالحکیم انصاری یوں بیان کرتے ہیں:

''مذہب کی بنیاد ان عقیدوں پر ہے۔ اللہ، فرشتے، الہامی کتابیں، رسول، قیامت، اور حیات بعد الموت۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم ان سب پر بغیر دیکھے اور بلا کسی دلیل کے ایمان لے آئیں، دنیا میں اس وقت تقریباً ستّر کروڑ مسلمان بستے ہیں اور سبھی ان عقائد کو بلا دلیل ہی مانتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے کچھ دماغ ایسے بھی بنائے ہیں جو کسی بات کو بھی بغیر دیکھے اور بلا سمجھے ماننے کو تیار نہیں ہوتے لیکن آج کی دنیا کے تمام عالموں، فلاسفروں اور دانشوروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو دلائلِ عقلی سے ثابت کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ وہ صرف وجدان ہی سے سمجھ میں آ سکتا اور دکھائی بھی دے سکتا ہے، چنانچہ یہی موضوع علم تصوف کا ہے۔'' (۱)

یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ تصوف ایسے افراد کا راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دلائل کی تلاش میں نہیں بلکہ اسے وجدان یا روحانی آنکھ سے دکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ فرض بھی کر لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سمجھا جا سکتا ہے، اس جستجو کو خواجہ صاحب تصوّف قرار دیتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اللہ کا حکم ہے کہ بغیر دیکھے اور بلا کسی دلیل کے اُس پر ایمان لایا جائے تو اس حکم کی خلاف ورزی کیوں؟ اور کیا یہ جستجو حکمِ الٰہی سے متصادم نہیں؟ اللہ تعالیٰ قرآن میں اپنے پرہیزگار اور نیک بندوں کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں،

۱۔ حقیقۃ وحدۃ الوجود ۔ صفحہ ۱۸۔۲۳

الَّذِیۡنَ یُوۡءۡ مِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

ترجمہ: جو غیب پر ایمان لاتے ہیں

قرآن کی اس آیت کو کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے غائب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے غلط تاویلوں سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس میں بغیر دلیل کے ایمان لانے کا حکم ہے، کسی چیز کو دیکھ کر ماننے یا اُس تک بذریعہ دلیل رسائی حاصل کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے اگر چہ دونوں اعمال کی منشا ایک ہی ہے کہ یقین حاصل ہو، قطعہ نظر اس کے کہ اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے یا نہیں خود اللہ ہی نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اُسے دیکھے بغیر ایمان لاو، لیکن یہ آیتِ کریمہ عقلِ انسانی کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دلیل لانے سے قطعاً منع نہیں کرتی بلکہ امر یہ ہے کہ غائب پر ایمان بغیر کسی عقلی دلیل کے ممکن ہی نہیں، قرآن اور رسولؐ از خود اللہ تعالیٰ کی عقلی دلیلیں ہیں جن کا درست ادراک اہل علم و عقل کو ہی نصیب ہے، خواجہ صاحب نہ جانے کن علما، فلاسفہ اور دانشوروں کی بات کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں عقلی دلیل نہیں رکھتے یا اسے ناممکن سمجھتے ہیں، حقیقتاً مسلمان علماء تو عقلی دلائل کے بغیر توحید پر ایمان ہی کو ایمانِ کامل نہیں سمجھتے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ

''وہ [اللہ] صرف وجدان ہی سے سمجھ میں آ سکتا اور دکھائی بھی دے سکتا ہے،'' (۲)

مگر اس کے برخلاف اسلام کا روزِ اول سے ہی یہ موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی بھی طور

۱۔ سورۃ البقرۃ ۱:۳

۲۔ حقیقۃ وحدۃ الوجود ۔ صفحہ ۱۸۔۲۳

[بشمولے وجدان] دیکھا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ ذاتِ باری ہر وجود سے پاک ہے اور کسی زمان و مقام کی حد میں سما نہیں سکتی تو پھر وہ کیسے سمٹ کر وجدِ انسانی کی گرفت میں آ سکتی ہے؟ خواجہ صاحب کے مندرجہ بالا استدلال و نظریات کے مطالعہ کے بعد جب اُن کی کتاب کے اس حصہ پر نظر پڑتی ہے کہ جس میں وہ خود ہی تصوف کو بیکار قرار دیتے ہیں تو یقین ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں فقط کنفیوژن پھیلانے کے اور کچھ نہیں کر رہے، وہ فرماتے ہیں

''مذہب کے دامن کو مضبوط تھامو اور جو چیز حدیث و قرآن کے خلاف ہو اس کو نیست و نابود کر دو خواہ وہ کوئی فیشن ہو یا رسم یا کوئی علم ہو مثلاً تصوف یا کوئی اور نظریہ ہو مثلاً وحدت الوجود، اصل چیز مذہب اور شرع ہے، تصوف تو بہت بعد کی بات ہے، شرع ہر زمانہ، ہر حالت اور ہر وقت تصوف پر فضیلت و فوقیت رکھتی ہے......عزیزو! مذہب کو اختیار کرو، مذہب کو بچاو یہی تم کو آخر تک بچائے گا. تصوّف اور وحدت الوجود تمہارے کسی کام نہ آئے گا'' (۱)

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ سارے طریقہ ہائے تصوف شجرہِ طریقت کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام اور دیگر آئمہ اثناءعشر سے جا کر ملائے جاتے ہیں جن کا علمی درجہ اور فضیلت کسی تعریف و تعارف کا محتاج نہیں لیکن اسلامی تاریخ میں کوئی بھی مکتبہ فکر اُنہیں کسی ایسی ریاضت میں مشغول نہیں دکھاتا جیسی کہ تصوّف میں کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں، حضرت علی علیہ السلام نے نہ تو زندگی کے عام دھارے سے کٹ کر خانقاہوں میں بسیرا

۱۔ حقیقۃ وحدۃ الوجود ۔ صفحہ ۵۵۔۵۶

کیا اور نہ ہی کشف و معرفت کے حصول کے لئے اُن جسمانی و ذہنی کیفیات کو علمی اور عقلی جستجو پر فوقیت دی جن سے اہلِ طریقت گزرنا لازم بیان کرتے ہیں، اگر خالصتاً قرآن، حدیث، اور اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں اس معاملے کا جائزہ لیا جائے تو بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ گمراہی کے راستہ کا آغاز ہی بغض نبی اور بغضِ آل رسولؐ سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ہے کہ غیر اسلامی فلسفہ کے سہارے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی غلط تاویلوں اور تشریحوں سے پراگندہ خیالات ونظریات کو عینِ اسلام ثابت کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ روحانیت اور مادیت انسان کے دو بنیادی اجزاء ہیں قدرت نے ان کے درمیان ایک توازن قائم کر کے اس دُنیا میں اُس کی زندگی کو عبارت کیا ہے، اسی زندگی میں اُسے معرفتِ الہٰیہ کے حصول کا حکم ہے، اکیلے جسم ایک بیکار شے ہے جبکہ تمام ارواح تخلیق کے فوراً بعد ہی اپنے رب کا اقرار کر چکی ہیں، نفس میں نیکی اور بدی کی طاقت ہے اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام انسان ہے جس پر عقل کو حاکم بنایا گیا کہ وہ اپنے اندر اُٹھنے والی تحریکوں کے زیر اثر درست یا غلط فیصلہ کرئے اور جزاء وسزا کا مستحق ٹھرے، لہٰذا معرفتِ الہٰیہ کو نہ تو فقط روح سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی صرف بزورِ مادیت، دونوں کا ایک توازنِ صحت میں رہنا ضروری ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کہ انسانی نفس بڑا طاقت ور ہے اور اس پر قابو پا کر ہی انسان کامیابی کا زینہ چڑھ سکتا ہے، لہٰذا نفس کی تادیب وتربیت ضروری ہے اور اس کو اُس مقام پر لانے کی جستجو کی جانی چاہے کہ وہ الفاظِ قرآنی میں نفسِ مطمئنہ کا درجہ حاصل کرلے، لیکن اسلام نفس کی تربیت معاشرے میں رہ کر دیگر فرائض کی بااحسن طریقے سے انجام دہی کے ساتھ کرنے کی ہدایت کرتا ہے، امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا نہج البلاغہ میں ارشاد ہے کہ بہترین عمل وہ ہے جس کے بجالانے پر انسان کو اپنے نفس کو مجبور کرنا پڑے، اور نفس کی

تربیت کا نسخہ فراہم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''نفس کی اصلاح کے لیے یہی کافی ہے کہ جن چیزوں کو دوسروں کے لئے برا سمجھتے ہو ان سے بچ کر رہو۔'' (۱)

اس مرحلہ پر اُن تمام طریقوں کی نفی ہو جاتی ہے جو غیر اسلامی فلسفہ کے اختلاط سے ایجاد کردہ ہیں، مولائے کائنات نے مومنین کی راہ نمائی کرتے ہوئے مزید وضاحت کر کے شک وشبہ کے تمام اندیشوں کو نیست و نابود کر دیا، وہ کہتے ہیں:

''مومن کے اوقات تین ساعتوں پر منقسم ہوتے ہیں، ایک وہ کہ جس میں اپنے پروردگار سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، اور ایک وہ جس میں اپنے معاش کا سرو سامان کرتا ہے، اور وہ کہ جس میں حلال و پاکیزہ لذتوں میں اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔'' (۲)

یہ ہے دین و دُنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کا بہترین نسخہ، اللہ سے راز و نیاز کا طریقہ اگر بازاری ملاؤں، نام نہاد علماء و دانشوروں اور بغضِ اہل بیت نبیؐ رکھنے والوں سے سمجھا جائے گا تو تصوّف جیسی بے سرو پا گمراہی ہی سامنے آئے گی، لیکن اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اہل بیت اطہارؑ کی سیرت اور راہ نمائی سے اس راز و نیاز کو سمجھا گیا تو راتوں کو نوافل اور تہجد نمازوں کی ادائیگی، تلاوتِ قرآن مجید، اور جستجوِ علم

۱۔ نہج البلاغہ

۲۔ ایضاً

اور اللہ جل شانہ پر توکل جیسے اعمال مومن کی زندگی کا شعار بن جاتے ہیں، سیرت، حدیث اور تاریخ کی کُتب بھری پڑی ہیں کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام رات کو دیر تک عبادتِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ عبادت کے لئے یقین و معرفت الٰہیہ لازم ہے جس کا انحصار علم پر ہے کیونکہ یہی تصدیق و شہادت کی منزل پر لے کر جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر دین اسلام کسی اور عمل کا مطالبہ نہیں کرتا، مولائے کائنات یہاں پر بھی راہ نمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسلام سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور سرِ تسلیم جھکانا یقین ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق اعترافِ فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے۔'' (۱)

یہ حکمت کے وہ موتی ہیں جو کہیں اور سے دستیاب نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے یہ ہی محورِ کائنات ہے، اور یہ عبادت وہ ہے جو یقین اور معرفت کے ساتھ کی جائے اور اس میں کوئی شک نہ آنے پائے، شک صرف وہاں ہی نہیں آئے گا جہاں علم ہوگا کیونکہ یہ یقین پیدا کرتا ہے، جہاں یقین ہوگا وہاں معرفت ہو گی، اور جہاں معرفت ہوگی وہاں انسان صرف مسلمان ہونے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ ایمان کی منزلیں تلاش کرے گا، اللہ تعالیٰ بھی انسان سے مسلمان ہونے کا تقاضہ نہیں کرتا بلکہ مومن ہونے کا مطالبہ ہے، مسلمان اُس پہلی سیڑھی کا نام ہے جس پر انسان کفر سے نکل کر پہنچتا ہے، لہٰذا یہ منزل نہیں، اللہ کے نزدیک مومن وہ ہے جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک نہ کرے، قرآن ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہتا

۱۔ نہج البلاغہ

ہے کہ اُنھیں نہ تو خوف ہوگا اور نہ ہی حزن ہوگا، یہ ہے وہ پہچان جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی دی ہے۔

اس طرح معرفتِ حقیقی تک رسائی کا جو معیار بنتا ہے وہ نہ صرف انسان کا زندہ، بیدار و ہوشمند، اور صحت مند ہونا لازمی قرار دیتا ہے بلکہ اُسے علم کے حصول، بُرائی اور نیکی سے خود کو آگاہ رکھنا، اور منزلِ یقین تک رسائی کی مسلسل جد و جہد کرنا بھی فرضیت میں داخل کر دیتا ہے، جب انسان جسمانی صحت اور یقین کی منزل پا لیتا ہے تو راہِ معرفت پر چل نکلتا ہے، اور بقول علامہ رشید ترابی مرحوم اس مقام پر وہ مکمل زیرکی میں ڈوبا ہوتا ہے، اور اپنے علم و عقل سے حکمت کے موتی تلاش کرتا ہے، دُنیا کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتا ہے اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے بندگانِ خدا کی معرفت کو دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ یقین کی کس منزل پر فائز تھے، نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں

> ''یقین کی چار شاخیں ہیں، روشن نگاہی، حقیقت رسی، عبرت اندوزی اور اگلوں کا طور طریقہ، چنانچہ جو دانش و آگہی حاصل کرے گا اس کے سامنے علم و عمل کی راہیں واضح ہو جاہیں گی۔'' (۱)

عرفانِ الٰہی وہ گوہرِ مقصود ہے جو جنگلوں اور صحراوں میں بھٹکنے اور علم و عقل سے کنارہ کشی اختیار کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے اسلام رہبانیت سے بیزار ہے، وہ شخصیت (حضرت علیؑ) کہ جن سے تصوف کے سارے سلسلے جا کر جوڑے جاتے ہیں یہ اعلان کرتے رہے کہ اگر زمین و آسمان کے تمام پردے ہٹا دیئے جاہیں تو پھر بھی اُن کے اللہ

۱۔ نہج البلاغہ

تعالیٰ پر یقین میں زرہ برابر فرق نہیں آئے گا، علماِ اسلام معرفتِ الٰہیہ کو تین اصولوں پر استوار قرار دیتے ہیں

۱۔ خوفِ الٰہی
۲۔ اُمیدِ الٰہی
۳۔ محبتِ الٰہی

یہ تینوں اصول اپنی بنیادیں رکھتے ہیں چنانچہ خوف علم کے بغیر نہیں ہوسکتا، اُمید یقین کے اور محبت معرفت کے، اللہ کا خوف اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک علم نہ ہو اور یہ کسی انسان کا قول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں فرماتا ہے

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمَآءُ (۱)

ترجمہ: اللہ سے تو اُس کے بندوں میں سے علم والے ہی ڈرتے ہیں.

اسی طرح اگر اللہ پر یقین نہ ہو تو اُس سے کسی بھی اُمید کو قائم نہیں کیا جا سکتا، یہ عقل کا تقاضہ ہے کہ اُس ہستی سے مانگا جائے جو عطا کرنے والی ہو، ایک معمولی سی سمجھ والا آدمی بھی کبھی ایسے شخص سے اُمید نہیں رکھے گا جس پر اُسے یقین ہو کہ پوری نہیں کرے گا، محبت معرفت کی وہ منزل ہے جہاں نافرمانی یا محبوب سے دوری محبّ کے لئے باعثِ تکلیف بن جاتی ہے۔

۱۔ سورۃ الروم،۲۲:۳۰

حاصل کلام

تصوف کے بارے میں اس تفصیلی بیان سے چند نہایت ہی اہم مگر عمومی طور پر غلط العام نظریات سے پردہ ہٹ گیا ہے، ان میں شامل نمایاں نظریات وعقائد یہ ہیں جانوروں میں روح کے پائے جانے، جانور اور انسان کی جان کو ایک ہی نوع کا سمجھا جانا، عقل اور روحانیت کو دو الگ اور متصادم حقیقتیں جاننا، اور تزکیہ نفس کے لئے اسلامی عبادت کے سیٹ کو چھوڑ کر دیگر مذاہب اور غیر اسلامی فلسفہ کے نام نہاد روحانی اثرات سے متاثر ہو کر اُن کے طریقہ ہائے کار کو نئے انداز سے اسلام میں متعارف کروانا ہیں۔

انسان اور جانور کی جان میں بہت بڑا فرق ہے، جانور کو روحانیت سے کوئی سروکار نہیں اور وہ فقط نفسِ حیوانیہ کی توسط سے زندہ ہے اور مر کر معدوم ہو جائے گا، انسان کو اشرف المخلوق بنا کر اللہ تعالیٰ نے عقل عطا کی ہے اور عقل چونکہ حیاتِ روح ہے اس لئے انسانی جان کو مادے اور روح کو یکجا رکھنے کے لئے ایک ممتاز (unique) کیفیت میں خلق کیا گیا ہے یہ کیفیت نفسِ حیوانیہ اور روح البدن کے ملاپ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کی ہے، لہٰذا روح کے بغیر بھی حیات اپنا وجود رکھتی ہے مگر انسانی حیات کے لئے روح ایک جزوِ لازم ہے جس کے بغیر یہ اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی، کائنات کو اللہ تعالیٰ نے اسباب وعلل (cause and effect) کے اصول پر خلق کیا ہے اور اس کی ہر حقیقت کے

پس منظر میں کوئی جواز یا وجہ رکھی ہے جس کو جاننے اور سمجھنے کی تحریک عقل کو عطا کی گئی ہے، عقل ایک روحانی شے ہے جو مادے یا نفس میں نہیں سما سکتی اس کا مسکن روح ہے اسی لئے نبی اکرمؐ نے اسے روح کی حیات قرار دیا ہے جس کے بغیر روح مردہ ہے اور ایسی مردہ روح کے حامل انسان کو پاگل یا مجنون کہہ کر جانوروں کے درجہ میں شمار کیا جاتا ہے ،عقل ہی وہ پاک ومقدس شے ہے جو اگر ایک لمحہ کے لئے بھی غافل یا انسان سے جُدا ہو جائے تو آدمی طہارت اور پاکیزگی کی منزل سے گر جاتا ہے اسی لئے ایک باوضو مسلمان کو نیند یا اونگ آجانے کی صورت میں دوبارہ وضو کر کے عبادتِ خدا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، ایسے تمام عمل اور مشروب حرام قرار دیئے گئے ہیں جن کے کرنے یا نوش کرنے سے عقل ماوف یا غافل ہوتی ہو۔

حیرت ہے کہ علمائے تصوف عقل اور روح کو نہ صرف دو الگ الگ بلکہ متصاد حقیقتیں سمجھتے ہیں، روحانی کیفیتوں کو عقل سے ماورا کہا جاتا ہے، جس طرح عقل مادی حواسِ خمسہ سے علم حاصل کرتی ہے اُسی طرح روحانی واسطوں سے بھی وہ تحصیل علم کرتی ہے، نفس پر قابو پانا اسلامی زندگی کا خاصہ ہے اور اسلامی عبادات کا خاصہ بھی، کوئی بھی فرض اور نفلی عبادت اس پہلو سے خالی نہیں لہٰذا نئے نئے طریقوں کی ایجاد اور دوسرے مذاہب کی نقالی اسلام میں کوئی معٰنی نہیں رکھتی، علم عقل کو ایمان و یقین کی منزل پر لاتا ہے اور یقین تصدیق وشہادت کی منزل پر، یہ ہی وہ مشکل ترین منزل ہے جہاں صبر کے دراجات کا آغاز ہوتا ہے، علماء نے صبر کے نو دراجات بیان کئے ہیں جن سے گزرنا معرفت الٰہیہ کے بغیر ممکن ہی نہیں، اگر صبر کی ان منزلوں کو سمجھنا ہے تو اللہ ھو، اللہ ھو کی صدا کاری اور نیلی پیلی روشنیوں میں بیٹھ کر سر جھٹکنے کے بجائے علم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ اُن ہستیوں کو بھی سمجھنا ہوگا جنھوں نے خوشنودیِ رب العزت کے لئے اپنے ہاتھوں سے کیڑے اُٹھا کر دوبارہ جسم پر رکھے، اللہ کی خوشنودی کے لئے بیٹے کی گردن پر چھری چلائی، مچھلی کے

پیٹ میں رہ کر بھی ذکر الٰہی کو وسیلہ نجات سمجھا، تبلیغِ دین کے لئے پتھر کھائے، فاقے کئے، ضربِ قاتل پر واویلہ کرنے کے بجائے فزت برب الکعبہ (ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا) کا نعرہ لگایا، اور کربلا جیسے لق و دق صحرا میں تاریخ کی بھیانک ترین درندگی کا سامنا کیا مگر اللہ جلِ شانہ کے لئے کلماتِ شکر ہی زبان پر آئے۔ جو لوگ عقل سے ہٹ کر اپنے زعم میں روح کے ذریعہ کیفیاتِ لطف وسرور اور خود ساختہ وجد میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ نفس اور شیطان کی کرشمہ سازیوں کا شکار ہیں، ان لوگوں کے لئے شیطان نے اُن کے اپنے ہی نفس اور وہم کو خُدا بنا رکھا ہے جس کو یہ اللہ سبحان تعالیٰ سمجھ کر پوج رہے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَايَعْقِلُوْنَ O

(یونس ۱۰:۱۰۰)

ترجمہ: اور جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان ہی لوگوں پر خُدا گندگی ڈال دیتا ہے.

وَمَا عَلَيْنا اِلَّا الْبَلَاغ

تتمہ

مغربی معاشرہ صدیوں تک جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں ڈوبا رہا، حقیق طور پر دیکھا جائے تو آج کا جدید مغربی معاشرہ ابھی تک اسی گمراہی کا شکار ہے مگر جدید علوم میں مہارت سے اُسے آج کی دُنیا میں مادی غلبہ حاصل ہو گیا ہے، جن نظریات نے اس معاشرے کی موجودہ شکل وصورت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اُن کا تعلق کسی بھی الہامی مذہب مثلاً عیسائیت اور یہودیت سے نہیں بلکہ یہ مذاہب کسی نہ کسی طور پر لادینیت (secularism) کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں تاہم مغربی زندگی پر اس کے غلبہ کو نہیں روک سکے، لادینت نے سب سے پہلے فلسفہ کو مذہب سے جُدا کیا پھر سائنس کو اور اس کے بعد زندگی کے معاشرتی، معاشی، اور سیاسی پہلوں کو مذہب کے دائرہ کار سے نکال باہر کیا، بیسویں صدی عیسوی کے آخری حصّے میں مذہب دشمن تحریکوں نے مغربی معاشرے میں مقبولیت حاصل کرنا شروع کی، ان تحریکوں میں سے ایک کا نام ''خدا کی موت'' (The Death of God) تھا، آہستہ آہستہ یہ غلبہ اتنا بڑھ گیا کہ آج کے جدید دور میں تقریباً تمام مغربی معاشرے خود کو لادین (secular) قرار دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، یہ معاشرے اپنے قوانین کو مذہب سے اخذ کرنے کے بجائے ان کی بنیادیں عوام کی آواز پر استوار کرتے ہیں لہٰذا جمہوریت اور قوت کا سرچشمہ عوام جیسے نظامات اور نعرے لوگوں کے عملی عقائد بن کر سامنے آ گئے اور لادین نظریات کو جدیدیت (modernism) کے نام سے پکارا جانے لگا، بدقسمتی سے جدیدیت کا یہ عفریت مسلمان معاشروں کو بھی شدید طور سے متاثر کر رہا ہے اور اس کے اثرات زندگی کے تمام پہلوں پر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، جن فلسفیوں نے مغربی معاشرہ کے جدید خدوخال کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اُن میں سے چیدہ چیدہ افراد اور اُن کے نظریات کا مختصراً بیان یہ ہے:

فرانسس بیکن (Francis Bacon) ۔ 1561-1626

اس فلسفی نے اشیاء کی مابعد الطبیعاتی خصوصیات سے انکار کیا اور اپنے نظریات کے ذریعے زندگی کے مختلف رازوں پر سے پردہ اُٹھانے کے لئے سائنس پر کلی طور پر انحصار کی ترغیب دی،

رینی ڈیکارٹس (Rene Decartes) 1596-1650

اسے مغرب میں بابائے منطق کہا جاتا ہے، اس نے اپنے افکار کے ذریعے یورپ میں حقیقت (reality) کے دو پہلوؤں یعنی مادیت (matter) اور شعور (consciousness) یا فکر (thought) کا پرچار کیا۔

تھامس ہوبز (Thomas Hobbes) 1588-1679

ہوبز نے اپنی تحریروں اور گفتگو کے ذریعے حِسیات (sensations) اور تصورات (perceptions) کی تشریحات سائنس کی ایک شاخ علم الحرکیات (Science of Motion) کی روشنی میں بیان کیں۔

جان لاک (John Locke) 1632-1704

یہ ایک بہت بڑا منطق پسند سیاسی مفکر تھا، اس کے نظریات نے امریکی سیاسی نظام پر بڑے دور رس اثرات مرتب کئے ہیں، جان کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو انسانی ذہن کو صاف تختی (tabula rasa or clean plate) قرار دیتے ہیں، اس نظریہ کو ماننے والے کہتے ہیں کہ انسان فطرتی طور پر کوئی علم لے کر نہیں آتا، وہ جو کچھ سیکھتا ہے اُس کا انحصار اُس کے تجربہ پر ہوتا ہے۔

فرانکوس میری والٹیر (Francois-Marie Voltaire) 1649-1778

یہ ایک آزاد خیال مفکر تھا جس نے مذہب اور مذہبی اداروں کی مخالفت کو اپنی تحریوں کا مرکز بنایا، اس کے نظریات نے فرانسیسی انقلاب کے لئے ایندھن کا کام کیا۔

جین جیکوس روسو (Jean-Jacques Rousseau) 1712-1778

اس نے اپنے زمانے کے سیاسی نظامات اور تعلیم کو ہدفِ تنقید بنایا۔

ڈیوڈ ھوم (David Hume) 1711-1776

یہ اشیاء کی ظاہریت پر یقین رکھتا تھا اور اس کے تمام تر نظریات اسی یقین کے گرد گھومتے تھے۔

کارل مارکس (Karl Marx) 1818-1883

اس نے مذہب کو عوام کی افیون (opium of the masses) کہا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ مذہب معاشرے میں ناانصافی اور طبقاتی تقسیم پیدا کرتا ہے۔

فریڈرک نتاشے (Friedrich Nietzsche) 1844-1900

اس نے عیسائیت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور خُدا کی موت کے فلسفہ کا پرچار کیا، یہ وہی مغربی مفکر ہے جس کو علامہ اقبال نے پڑھا اور اس کے افکار کی جھلک علامہ کے کلام میں بھی ملتی ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) 1856-1939

اس نے مذہب کو دھوکہ یا فریب (illusion) کہا اور انسان کی کامیابی کے لئے سائنس کو بنیاد بنانے کی ترغیب دی۔

برٹرینڈ رُسل (Bortrand Russell) 1872-1970

اس نے ہر اُس چیز کا انکار کیا جو منطقی طور پر ثابت نہ کی جاسکتی ہو، اس نے مذہب اور مابعدالطبعیات پر کڑی نکتہ چینی کی۔

جین پال سارترے (Jean-Paul Sartre) 1905-1980

یہ شادی کو اعلیٰ طبقہ کی محض ایک رسم اور مذہب کی باقیات سمجھتا تھا، سارترے مذہب کا شدید ترین مخالف تھا